(الاعتصام بحبل اللّٰہ)

(اللہ کے دین کو مضبوطی سے تھام لو)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	تمہید	۱۰
۲	تبدیلی مضمون	۱۱
۳	تحقیق واقعہ کی شرائط	۱۳
۴	مراتب شعبہ جات	۱۳
۵	تبدد اور تعدد میں فرق	۱۴
۶	کثرت مساجد کی ضرورت	۱۴
۷	مسجد ثانی کی تعمیر کی دو صورتیں	۱۵
۸	بانیان مسجد کی بنا پر مسجد کا حکم	۱۵
۹	بانی کے عقیدہ میں تردد کی صورت میں مسجد کا حکم	۱۶
۱۰	مدارس متعددہ کے احکام	۱۶
۱۱	ایک شہر میں متعدد مدارس	۱۷
۱۲	قول فیصل	۱۸
۱۳	اہل مدارس کا فرض	۱۹
۱۴	مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا مدرسہ	۲۰
۱۵	اختلاف دور کرنے کے لئے کمیٹی کا قیام اور اس کی ذمہ داری	۲۱

۱۶	مہتمم مدرسہ کی حیثیت	۲۱
۱۷	حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا طرز عمل	۲۲
۱۸	مشورہ	۲۲
۱۹	مقصود مدارس	۲۳
۲۰	حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی حصول چندہ میں احتیاط	۲۳
۲۱	مخالفین میں صلح کرانے کا طریقہ	۲۴
۲۲	اتفاق کی صورت وحقیقت	۲۵
۲۳	اتفاق کی ناپسندیدہ صورت	۲۷
۲۴	مطلق اتفاق پسندیدہ نہیں	۲۸
۲۵	آج کل کے مدعیان اتفاق کا حال	۲۹
۲۶	مقام ازالہ وامالہ	۳۱
۲۷	شیخ کا کام	۳۲
۲۸	امالہ کی خوبی	۳۲
۲۹	عشق مجازی کا علاج	۳۴
۳۰	شرک باللہ	۳۴
۳۱	مشرکانہ عقیدہ	۳۵
۳۲	مشرکوں کا حال	۳۶
۳۳	مسلمانوں کی حالت زار	۳۷
۳۴	علماء کا حال	۳۸

۳۵	حضور ﷺ کے زمانے میں موجود باطل مذاہب	۳۹
۳۶	کفار کا حضور ﷺ کو حَکَم بنانا	۴۰
۳۷	حضور ﷺ کا منصفانہ فیصلہ	۴۲
۳۸	حقیقی اتفاق	۴۳
۳۹	رسول اللہ ﷺ کو کفار کی پیش کش	۴۳
۴۰	حضور ﷺ کا جواب اور کفار کی حیرانی	۴۴
۴۲	اتفاق مطلقاً مطلوب نہیں	۴۵
۴۲	حضور ﷺ کی ثابت قدمی	۴۵
۴۳	پسندیدہ اتفاق	۴۶
۴۴	حق پر قائم رہنے کی ضرورت	۴۶
۴۵	اصلاح کا طریقہ	۴۷
۴۶	اسلام اور تلوار	۴۸
۴۷	اسلام کا عدل وانصاف	۴۹
۴۸	یہودی کا قبول اسلام	۵۰
۴۹	آج کل مسلمانوں کا حال اور اس کا نتیجہ	۵۱
۵۰	اسلام کمزور نہیں اہل اسلام کمزور ہیں	۵۱
۵۲	حقانیت اسلام	۵۲
۵۳	قوت اسلام کی دلیل	۵۳
۵۳	قوتِ ایمانی	۵۴

۵۴	چراغ خداوندی	۵۵
۵۵	بے وقوف کی حکایت	۵۷
۵۶	بزرگوں کی نشست	۵۸
۵۷	حکم کا مرتبہ ادب سے بڑا ہے	۵۹
۵۸	سجادہ نشینی	۶۰
۵۹	ضرورتِ توکل	۶۱
۶۰	اہل مدارس کو نصیحت	۶۲
۶۱	حسن اعتقاد کا فائدہ	۶۳
۶۲	حبل اللہ	۶۴
۶۳	شریعت کا انتظام	۶۵
۶۴	دنیا سے تعلق	۶۶
۶۵	علماء کی ترقی	۶۶
۶۶	علماء کے کھانے پینے کا انتظام	۶۶
۶۷	سوء انتخاب	۶۷
۶۸	طالب علم کا توکل	۶۸
۶۹	طلباء کے کھانے کا جبری انتظام	۶۸
۷۰	دیندار جماعت کی ضرورت	۶۹
۷۱	تفسیر آیت	۶۹
۷۲	خلاصہ وعظ	۷۰

وعظ

(الاعتصام بحبل اللّٰہ)

(اللہ کے دین کو مضبوطی سے تھام لو)

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے وعظ ''الاعتصام بحبل اللہ'' صبح کے وقت ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۶ھ بروز یک شنبہ بمطابق ۲۴ فروری ۱۹۱۸ء مظفر نگر میں مدرسہ کے جلسہ کے موقع پر ڈیڑھ ہزار کے مجمع میں کھڑے ہوکر بیان فرمایا حضرت مولانا محمد اسعد اللہ صاحب ناظم مظاہر علوم نے قلم بند فرمایا۔

موضوع تھا کہ تفرقہ پیدا نہ کیا جائے باہم اتفاق سے رہا جائے اتفاق کی حقیقت بیان کی اتفاق محمود و مذموم کو بیان کیا۔ مدارس کے مہتمم و منتظمین میں اختلاف کی صورت میں ضابطہ اخلاق اور اس کے تدارک کی صورت بیان کی۔

کثرت مساجد و مدارس کے وجود وفوائد اور طریقہ کار کو بیان کیا۔ اہل مدارس اور علماء کے لئے یہ وعظ بہت مفید ہے عوام بھی اس کے مطالعہ سے اتفاق کی حقیقت سمجھ کر بلاوجہ کی الزام تراشی سے اپنے کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ تمام مستفیدین کو توفیق عمل عطا فرمائے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

۳۰/ اگست ۲۰۱۳ء

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ و بارك وسلم **اما بعد:**

فأعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرّحمن الرّحیم

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ص وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا ج وَکُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْھَا ط کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ○ وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ ط وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَاجَآءَھُمُ الْبَیِّنٰتُ ط وَاُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ○ یَّوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْہٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْہٌ ج فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْھُھُمْ قف اَکَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا کُنْتُمْ تَکْفُرُوْنَ ○ وَ اَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْھُھُمْ فَفِیْ رَحْمَۃِ اللّٰہِ ط ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ○﴾(۱)

''اور مضبوط پکڑے رکھو اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو اس طور پر کہ باہم متفق بھی رہو اور

(۱) سورۃ ال عمران: ۱۰۳، ۱۰۷۔

باہم نا اتفاقی نہ کرو اور تم پر جو اللہ تعالیٰ کا انعام ہے اس کو یاد کرو۔ جب کہ تم دشمن تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت (۱) ڈال دی۔ سو تم اللہ تعالیٰ کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہوگئے۔ اور تم لوگ دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے۔ سو اس سے خدا تعالیٰ نے تمہاری جان بچائی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو اپنے احکامات بتلاتے رہتے ہیں تا کہ تم لوگ راہ پر رہو۔ اور تم میں ایک ایسی جماعت ہونا ضروری ہے کہ نیک کاموں کے کرنے کو کہا کریں اور بُرے کاموں سے روکا کریں اور ایسے لوگ پورے پورے کامیاب ہوں گے۔ تم لوگ ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا۔ جنہوں نے باہم تفریق (۲) ڈالی اور باہم اختلاف کرلیا۔ اور اُن کے پاس احکام واضح پہنچنے کے بعد۔ اور ان لوگوں کے لئے سزائے عظیم ہوگی اُس روز کہ بعض چہرے سفید ہوں گے اور بعض چہرے سیاہ ہوں گے۔ ان سے کہا جائے گا کیا تم کافر ہوئے تھے ایمان لانے کے بعد سو سزا چکھو بسبب اپنے کفر کے۔ جن کے چہرے سفید ہوں گے، وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے"۔

تمہید

جس تقریب کے متعلق یہ جلسہ ہے اُس کے متعلق سب سے اول یہ امر ہے کہ ہم غرض جلسہ کے مقابل سے بالکل خالی الذہن تھے۔ (۳) اُس جانب مخالف (۴) کا ہم کو کچھ وہم وگمان نہ تھا واقعات مسموعہ (۵) سابقہ ذہن نشین تھے۔ یک طرفہ حالات ذہن میں متمکن تھے (۶)۔ اس کے بعد روایات سے دگر گوں حالات (۷) معلوم ہوئے اور پہلے فوائد میں مفاسد کی جھلک نظر آنے لگی جس سے

(۱) محبت (۲) نااتفاقی (۳) سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جلسہ کس غرض سے منعقد کیا گیا ہے ہم اس سے بالکل خالی الذہن تھے (۴) دوسری جانب کا (۵) پہلے سنے ہوئے واقعات ہی ذہن میں تھے (۶) ایک طرف کی بات ذہن میں تھی (۷) کچھ مزید روایات سے یہاں کے حالات خراب ہونے کا علم ہوا۔

تردد پیدا ہوا(۱)۔ یعنی مخالفت کا قصہ سنا جس سے علم بدلا اور چونکہ مشورہ علم پر مرتب ہوتا ہے۔ اس لئے پہلے اور مشورہ تھا اور اب دوسرا مشورہ ہوا البتہ تحقیق واقعات سے ایک شق کو ترجیح ہوسکتی تھی۔ سو میں نے واقعات کی تحقیق نہیں کی اور حالات کے انکشاف میں سعی (۲) سے کام نہیں لیا کیونکہ اُس کا کوئی وسیلہ وذریعہ نہ تھا۔ نیز مجھ کو اس کی کچھ احتیاج بھی نہیں تھی۔ لیکن محض اسلام کی خیر خواہی سے میں نے اپنی رائے کی حالت ظاہر کردی کیونکہ مقصود تو فقط دین کی خدمت ہے جس طرح ہوسکے۔ باقی سب امور نا قابل التفات ہیں۔

تبدیلی مضمون

میرا مضمون اس رائے بدلنے سے پہلے اور تھا۔ اُس میں اور قسم کے مصالح تھے اور اُسی کے متعلق ذہن میں ایک خاص مضمون تھا۔ اب تبدیل رائے سے مضمون بھی متبدل ہوا۔ جس آیت کی میں نے تلاوت کی ہے اُس کا مضمون تبدیل رائے کے بعد کا ہے۔

مضمون اول بھی بالکل حق تھا اور یہ مضمون بھی بالکل صادق ومطابق واقع کے ہے۔ کیونکہ دونوں مضمون قرآن پاک ہی کے مدلول ہیں۔ اس لئے دونوں کے دونوں اپنے اپنے محل میں صادق وحق ہیں (۳) کیونکہ دونوں قضایائے شرطیہ کے تحت میں مندرج ہیں کہ اگر اس شرط کا تحقق ہوا تو یہ جزا مرتب ہوگی (۴) اور اگر اُس مقدم کا تحقق ہوا تو یہ تالی مرتب ہوگی اور ان دونوں شرطوں میں کچھ تضاد وتنافی نہیں ہے بلکہ اپنی اپنی شرط کے اعتبار سے دونوں صادق ہیں۔ (۵)

---

(۱) پہلے بیان کرنے کے جو فوائد سمجھ میں آرہے تھے ان میں کچھ شبہ پڑ گیا بوجہ مخالفت کے قصہ کے۔ اس قصہ کو سنکر علم بدلا اور مشورہ موقوف علم پر ہوتا ہے اس لئے اب دوسرے مضمون بیان کرنے کا مشورہ ہوا (۲) حالات کی حقیقت جاننے کی کوشش نہیں کی (۳) دونوں مضامین اپنی اپنی جگہ درست اور حق ہیں (۴) کیونکہ دونوں ایک ایک شرط پر منطبق ہیں اگر ایک کی شرط پائی جائے وہ درست دوسرے کی پائی جائے وہ درست (۵) دونوں شرطوں میں کوئی مخالفت ومنافات نہیں ہیں۔

تبدل واقعہ سے تبدل مضمون کی مثال حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فتوے کا قصہ ہے کہ ایک شخص حضور پرنور ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور صوم میں قُبلہ (۱) کی اجازت مانگی۔ جناب رسالت مآب ﷺ نے اس کو ممانعت فرمادی۔ اس کے بعد ایک دوسرا شخص آیا اور اس نے بھی روزہ کی حالت میں بوسہ (۲) کی اجازت طلب کی تو آنجناب ﷺ نے اجازت دے دی۔

اب بظاہر یہ دونوں حکم متعارض و متناقض معلوم ہوتے ہیں (۳) لیکن صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین بڑے نکتہ سنج، نکتہ رس (۴)، دقیقہ شناس اور باریک بین تھے۔ انہوں نے اس ظاہری تعارض کے دفع کرنے کے واسطے (۵) ان دونوں حکموں کے اصلی محل تلاش کر لئے، اور سمجھ گئے کہ دونوں حکم علیحدہ علیحدہ محل کے واسطے ہیں (۶)۔ ممانعت کا حکم اس واسطے تھا کہ سائل ایک نوجوان قوی شخص تھا۔ جس سے تحمل واجتناب عن الجماع کی امید نہ تھی (۷)۔ اس لئے آنحضور ﷺ نے منع فرمادیا تاکہ جماع میں مبتلا ہوکر صوم کی اضاعت نہ کرے (۸) اور جس شخص کے سوال پر جناب نے اجازت فرمادی وہ شخص ایک کمزور اور بوڑھا تھا۔ اُس کے قوی مضمحل تھے اُس سے وقوع فی الجماع کا خوف نہ تھا۔ (۹) اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اجازت کی علت محض بوڑھا پا نہ تھا بلکہ اس کی علت فتنہ کا نہ ہونا ہے اور خوف فتنہ ہی پر اجازت و ممانعت کا مدار ہے (۱۰) کہ جس مقام پر اندیشہ فساد

(۱) حالت روزہ میں بیوی کا بوسہ لینے کی اجازت چاہی (۲) بیوی کو پیار کرنے کی اجازت مانگی (۳) بظاہر دونوں حکم ایک دوسرے کے خلاف معلوم ہوتے ہیں (۴) مسائل کی تہہ تک پہنچ کر مسائل کی تحقیق کرتے تھے (۵) اس اختلاف کو دور کرنے کے لئے (۶) یہ دونوں حکم الگ الگ لوگوں کے لئے ہیں (۷) نوجوان تھا اس سے امید نہیں تھی کہ بوس و کنار کے بعد جماع میں مبتلاء ہونے سے بچ سکے (۸) اسے منع کردیا کہیں جماع کرکے روزہ ہی نہ خراب کرلے (۹) وہ کمزور بوڑھا تھا بوس و کنار کے بعد اس کے جماع میں مبتلا ہونا کا امکان نہیں تھا۔ (۱۰) اجازت کی علت بڑھاپا نہیں بلکہ فتنہ میں مبتلاء ہونے کا خوف تھا اور خوف فتنہ ہی پر اجازت و ممانعت موقوف ہے۔

صوم ہو، وہاں ممانعت ہے گو بوڑھا ہی ہو اور جہاں فتنہ کا خوف نہ ہو، وہاں اجازت ہے گو جوان ہی ہو۔

تحقیق واقعہ کی شرائط

بس جیسے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کے یہ دونوں ارشاد اختلاف واقعہ کی وجہ سے متعارض نہیں اسی طرح میرے دونوں مضمون بھی بوجہ اختلاف واقعہ مسموع کے متناقض نہیں رہے(۱)۔ یہ بات کہ واقعہ میں کون سی حالت صحیح ہے۔ آیا یہ فریق حق پر ہے یا وہ فریق حق پر ہے، تو اس کی حاجت اُسی شخص کو ہے جس کو اس سے دلچسپی ہو اور اس کے پاس اس کی تحقیق کے ذرائع ووسائل بھی موجود ہوں اور اس کی ضرورت واحتیاج بھی سمجھتا ہو۔ ہماری شرطیات کے واسطے کسی واقعہ کی تحقیق کی حاجت نہیں۔ ہم تو دونوں مضمون بیان کئے دیتے ہیں اور دونوں مضمون حق ہیں۔ ہر شخص اپنی حالت کو جس مضمون کے مطابق سمجھے منطبق کرلے۔

مراتب شعبہ جات

جو مضمون ذہن میں سابق تھا اُس کا حاصل یہ ہے کہ ایک مطلوب کام میں اُس کے طریق کی دو شاخیں ہوں یا ایک درخت کی دو ڈالیاں ہوں یا ایک لشکر کے دو حصے ہوں۔ غرض کہ ایک شے میں بوجہ انشعاب(۲) کے دو یا زیادہ شعبے ہوجاویں۔ تو اس انشعاب کے دو مرتبے ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ تعدد کا ہے(۳) جس کی مثال ایک شہر کی مساجد ہیں اور دو شہروں کے مدارس وخانقاہ اور ایک مرتبہ تبدد کا ہے(۴)۔ میں لفظ تفرق کا استعمال کرتا لیکن چونکہ طالب علم ہوں اس لئے

(۱) دونوں مضامین سنے ہوئے واقعات کی بنیاد پر اب ایک دوسرے کے معارض نہیں (۲) مختلف شعبوں کے (۳) ایک شہر میں کئی مسجدیں ہوں کئی مدرسے ہوں (۴) ایک دوسرے کے مخالف ومزاحم۔

قافیہ کے لحاظ کی وجہ سے یہ غیر مانوس لفظ اختیار کیا۔ اس کے معنی بھی تشتت وتفرق کے ہیں کہ تعدد کے ساتھ اُس میں تفرق وتزاحم کا بھی پہلو ہو۔

تبدد اور تعدد میں فرق

اب سمجھئے کہ مطلوب کے طریق میں مرتبہ تعدد تو مرغوب ومطلوب ومستحسن ہے ﴿وَ فِيْهِ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾ ''اور حرص کرنے والوں کو ایسی حرص کرنی چاہئے'' بخلاف تبدد(۱) کے کہ وہ موجب فساد ہے اور مہیج فتنہ ہے(۲) (وَعَنْهُ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ)(۳)۔ تعدد کی مثال مساجد ہیں کہ ایک دینی خدمت کی چند شاخیں ہیں۔ اپنی خدمت یہ تھی کہ ایک ایسا مکان تیار ہو جس میں فریضہ صلوٰۃ سے سبکدوش ہوں اور اب اس میں کثرت مصلین وضیق مکان اور دوراستے آمدورفت کی تکلیف کی وجہ سے۔ ایک مکان(۴) کافی نہیں تھا۔ لہذا مختلف مقامات پر چند مسجدیں تیار کرائی جاتی ہیں۔ سو یہ تو تعدد ہے کہ ایک دینی خدمت کے ادا کے لئے متعدد مقامات تجویز ہو گئے لیکن تبدد نہیں(۵)۔ چونکہ مذموم ہے کیونکہ تبدد کا مدار ضرورت پر نہیں ہوتا بلکہ اُس کا مبنی داعیہ نفسانی اور غرض فاسد ہوتی ہے۔ تو تعدد مساجد اگر نمازیوں کی کثرت اور تنگی مکان وغیرہ سے ہو تب تو تعدد ہے ورنہ پھر تعدد نہیں بلکہ یہ بھی تبدد ہو جائے گا اور تعدد بعض مرتبہ بہت ضروری ہوتا ہے کہ بغیر تعدد کے ہم دینی خدمت سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔

کثرت مساجد کی ضرورت

مثلاً یہاں مظفر نگر میں تعدد مساجد ہے کہ یا شند(۶) درجہ ضروری ہے

(۱) مخالفت (۲) فتنہ برپا کرنے والا (۳) اس میں رغبت کرنے سے بچنا چاہئے (۴) نمازیوں کی کثرت اور جگہ کی تنگی کی بنا پر (۵) اس میں اختلاف نہیں (۶) جس کی سخت ضرورت ہے۔

کیونکہ اگر تمام مظفر نگر میں صرف ایک ہی مسجد ہو تو اکثر لوگ مسجد و جماعت اور اُس کے ثواب جزیل سے محروم رہیں (۱)۔ لہذا الامحالہ تعدد ضروری ہوا (۲)۔ اور تبدد پیدا ہوتا ہے باہمی نزاع (۳) ومخالفت کی وجہ سے۔ اُس کا مبنی جھگڑا اور فساد ہوتا ہے۔ وہ کسی ضرورت دینی کی انجام دہی کے واسطے نہیں کیا جاتا بلکہ اُس کا مدار صرف آتش حسد وفساد پر ہوتا ہے (۴)۔ لیکن اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔

مسجد ثانی کی تعمیر کی دو صورتیں

ایک صورت تو یہ ہے کہ فریق اول یقیناً حق پر نہیں ہے وہ قطعاً خطاء فاحش (۵) میں مبتلا ہے اور غلطی کا مرتکب ہے۔ اس لئے دوسرے فریق نے اس کے مقابل دوسرا انتظام کیا۔ سو یہ تو مذموم نہیں (۶)۔ مثلاً کسی شخص نے مال حرام سے مسجد تیار کرائی یا ارض مغصوبہ (۷) میں مسجد بنائی تو اُس کے مصلی قبل از علم تو معذور ہیں (۸) اور بعد از علم دوسری مسجد بنانے میں کچھ حرج نہیں بلکہ واجب ہے کہ مسجد سابق میں نماز نہ ادا کریں اور اس جدید مسجد کے بنانے میں اگر کچھ منازعت (۹) پیش آوے اُس کو حدود شرعیہ ملحوظ رکھ کر گوارا کریں۔

بانیان مسجد کی بنا پر مسجد کا حکم

دوسری صورت یہ ہے کہ فریق اول یقیناً حق پر ہے اُس میں کسی قسم کا نقص نہیں یا اس کے حق پر ہونے نہ ہونے میں مساوی (۱۰) درجہ میں تردد ہے۔ مثلاً پہلی مسجد کوئی شخص اپنی ارض مملوکہ میں مال طیب (۱۱) سے بنوائے اور وہ اپنی

(۱) کہ مسجد میں جماعت سے نماز کا ثواب باون گنا ہوتا ہے (۲) زیادہ مساجد بنانا ضروری ہوا (۳) بلاضرورت صرف مخالفت کے سبب دوسری مسجد بنانا (۴) اس کی بنیاد حسد وفساد کی آگ پر ہوتی ہے (۵) کھلی غلطی پر ہے (۶) برا نہیں (۷) زمین پر ناجائز قبضہ کر کے مسجد بنائی (۸) اس میں نماز پڑھنے والوں کو جب تک اس کا علم نہ ہو تو معذور ہیں (۹) جھگڑا بھی ہو (۱۰) دونوں جانبیں برابر ہیں (۱۱) اپنی زمین میں پاکیزہ مال سے بنائے۔

وسعت مکانی سے سب اہل محلّہ کو کافی ہو۔ غرض کہ اس میں کسی قسم کی خرابی نہ ہو۔ اب اس مسجد کے مقابلہ میں جو مسجد تیار کرائی جائے گی اس کا مدار صرف باہمی اختلاف و منازعت ہوگا کہ دوسری پارٹی ہوجاوے۔ یہ صورت تبدو مذموم(۱) کی ہے اور ایسی جگہ مسجد بنانا ناجائز ہے۔

بانی کے عقیدہ میں تردد کی صورت میں مسجد کا حکم

اسی طرح تردّد کی صورت کو سمجھئے کہ بانی اول کا خطا پر ہونا نہ ہونا یقیناً معلوم نہیں۔ صرف بعض لوگوں کا خیال ہے جو کہ بعض امارات وعلامات کی وجہ سے ناشی ہوا ہے(۲) کہ بانی اول خطا پر ہے تو اس کے واسطے (اَلْیَقِیْنُ لَا یَزُوْلُ بِالشَّکِّ)(۳) کافی ہے کہ محض شک کی بنیاد پر دوسرے شخص کی مخالفت نہیں چاہئے۔ مصلحت دینیہ کا مقتضا یہ ہے کہ اول تو ہر زمانہ میں عموماً اور اس زمانہ میں خصوصا تذبذب و تردد کو چھوڑ دے اور بانی اول پر بنا بر استصحاب حال کے بدگمانی نہ کرے۔ البتہ اس کے اغراض و مقاصد دینی کی تکمیل میں جو کچھ نقص ہو اس کی اصلاح میں سعی جمیل کرے(۴)۔

مدارس متعددہ کے احکام

اب اس مسجد کی مثال کے ذہن نشین ہونے کے بعد سمجھنا چاہئے کہ دین کے صرف دو شعبے ہیں۔ ایک علم اور دوسرا عمل۔ اور جس طرح کہ مسجد دارالعمل ہے۔ اسی طرح مکاتیب و مدارس دارالعلم ہیں۔ یعنی دو قسم کے امکنہ تیار ہونا مطلوب ہے۔ ایک تو فریضہ عمل سے سبکدوش ہونے(۵) کے لئے جن کو مساجد

(۱) یہ صورت بطور اختلاف مسجد بنانے کی ناپسندیدہ ہے (۲) بعض علامتوں اور نشانیوں کی وجہ سے پیدا ہوا ہے (۳) یقین شک سے زائل نہیں ہوتا (۴) عمدہ کوشش (۵) عہدہ برآ ہونے کے لئے۔

کے لقب سے ملقب کیا جاتا ہے اور دوسرے فریضۂ علم سے سبکبار(۱) ہونے کے لئے جن کو مدارس کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اب مسجد و مدرسہ میں اس اعتبار سے کچھ فرق نہیں کہ دونوں کے دونوں دینی خدمات کی انجام دہی کے واسطے مہیا ہوتے ہیں۔ لہذا مدرسہ کے تعدد و تبدد(۲) میں بھی وہی تفصیل ہوگی جو مسجد کے تعدد و تبدد میں ہے۔ کہ اگر پہلا مدرسہ بالکل حق پر ہے اور اس میں کسی اعتبار سے کسی قسم کی منقصت نہیں(۳) جس کی تکمیل کے واسطے دوسرے مدرسہ کا افتتاح ہو۔ تب تو اس مدرسہ موجودہ کے مقابلہ میں کوئی دوسرا مدرسہ بنانا ناجائز ہے کیونکہ یہ تبدد مذموم کے افراد میں سے ہے(۴)۔ یا یہ کہ پہلے مدرسہ کے حق پر ہونے نہ ہونے میں تردد ہے تب بھی بمقتضائے مصلحت تعدد کو اختیار نہ کرے۔ اگر ممکن ہو اس کی شکایات کی اصلاح کردے۔ اور اگر مدرسہ سابقہ یقیناً خطا پر ہے یعنی وہ دینی خدمت انجام دہی سے مجتنب و گریزاں(۵) ہے تب دوسرا مدرسہ قائم کرنا ضروری ہے اور جس طرح کہ مساجد میں ایک درجہ ضرورت تعدد کا ہے اسی طرح مدارس میں بھی بعض اوقات بوجوہ مذکورہ تعدد لازمی ہے اور جہاں صرف تعدد ہوتا ہے وہاں کچھ منازعت و فساد نہیں ہوتا بلکہ سب لوگ ایک ہی رشتہ میں منسلک ہوتے ہیں۔

ایک شہر میں متعدد مدارس

چنانچہ بخارا میں تین سو اکسٹھ مدرسے ہیں اور کبھی کچھ شور و غوغا بلند نہیں ہوتا اور دیکھئے سرکاری مدارس میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا کیونکہ سب ایک محکمہ کے ماتحت ہوکر اپنے فرائض منصبی کو ادا کرتے ہیں۔ انگریزی اسکولوں کالجوں میں کبھی

(۱) فریضہ علم کی ادائیگی کے لئے (۲) کثرت واختلاف (۳) کمی نہیں (۴) ناپسندیدہ اضافہ کی ایک صورت ہے (۵) دین کی خدمت ہی نہیں کررہا۔

جھگڑا نہیں ہوتا کیونکہ ان مقامات پر صرف تعدد ہی ہوتا ہے اُن میں تبدد کی شان نہیں ہوتی ورنہ وہ بھی تو آدم علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد ہیں۔ اُن میں بھی تو منازعت ومشاجرت کا مادہ ہے۔

غرض تعدد تو قرین مصلحت ہے اور اس کی ضرورت بھی ہے ورنہ سخت سے سخت مشکلوں کا سامنا پڑ جائے اور تبدد بالکل مذموم اور واجب الترک ہے۔

قول فیصل

اب جو شخص مدرسہ سابقہ کے حال سے ناواقف ہو۔ اس کو تو چاہئے کہ وہ دونوں مدرسوں کی اتحاد کی کوشش کرے کیونکہ تردد کی صورت میں جو تعدد ہوتا ہے وہ حکما تبدد ہی کا فرد ہے(۱)۔ اس لئے بمقتضائے مصلحت دینی اُس سے اجتناب کیا جائے اور جو شخص حقیقت حال سے واقف ہو اور اُس کو اصل حالت معلوم ہو وہ اپنے علم کے موافق فیصلہ کرے۔ چونکہ مجھے بھی معلوم نہیں کہ یہاں پر کون حق پر ہے اور کون غلطی پر ہے اور نہ مجھے اس کی کچھ احتیاج ؎

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار کار ملکست آنکہ تدبیر وتحمل بایدش(۲)

اس لئے محض اسلام کی خیر خواہی اور دینی خدمت کی انجام دہی کے واسطے میں نے بانیان جلسہ کو یہ رائے دی ہے کہ وہ اس انشعاب(۳) وتفرق کو دور کریں اور باہم متحد ہو جاویں اور اپنی متفقہ قوت سے اسلام کے اغراض کو (عَلَی وَجْہِ الْکَمَال)(۴) پورا کریں۔ آئندہ امتثال وعدم امتثال کا ان سب حضرات کو اختیار ہے(۵) میرا قول صرف رائے اور مشورہ کے درجہ میں ہے جس کا امتثال و

(۱) تردد کی شکل میں جو دوسرا مدرسہ بنایا جائے گا وہ بھی اختلاف ہی کی صورت ہوگی اس سے بچیں (۲) جس کے دل میں دنیا کو جلا دینے والی آگ روشن ہو اس کو مصلحت سے کیا سروکار یہ تو بادشاہوں کا کام ہے کہ وہ تدبیر ومصلحت سے کام لیتے ہیں (۳) آپس کے اختلاف کو دور کریں اور الگ الگ شعبے قائم نہ کریں (۴) اعلی درجہ میں (۵) میری بات ماننے نہ ماننے کا سب کو اختیار ہے۔

عدم امتثال میرے نزدیک دونوں مساوی ہیں(۱)۔

اہل مدارس کا فرض

اب میں دوسری جانب بھی یعنی مدرسہ سابقہ والوں کو یہی مشورہ دیتا ہوں کہ وہ بھی اس منازعت کی مدافعت کی کوشش کریں اور اس کی صورت یہ ہے کہ جو شبہ منشا ہوا ہے مخالفت کا اُس کو رفع کردیں کیونکہ بدون کسی منشا مخالفت کے مشکل ہے کہ لوگ مخالفت پر آمادہ ہوں۔

تانبا شد چیز کے مردم نہ گویند چیز ہا(۲)

اکثر تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ منشا مخالفت کی کچھ نہ کچھ اصل ہوتی ہے جس کو مخالفین اور نمک مرچ لگادیتے ہیں۔ گو بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بدون کسی منشا(۳) واصلیت کے مخالفین طومار باندھ(۴) دیتے ہیں۔ مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے اور دوسرے حضرات گو واقع میں کسی شرعی خرابی میں مبتلا نہ ہوں اور نہ عنداللہ ان سے کچھ مواخذہ ہو لیکن موجودہ حیثیت سے ضرورت ہے کہ وہ ان شبہات کو جو ان پر عائد کئے جاتے ہیں دور کردیں کیونکہ اس امر کی خود مدرسہ کو بھی احتیاج ہے۔ اس لئے کہ آج کل قریب قریب سب مدارس کا دارومدار چندہ پر ہے۔ شخصی مدارس بہت نادرالوجود ہیں۔ جب عوام الناس بدظن ہوجاویں گے تو چندہ کون دے گا اور پھر مدرسہ کس کے بازوؤں کی طاقت سے چلے گا۔ لہذا عوام الناس کی جمعیت خاطر اور تسلی تشفی کے لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ شبہات کو رفع کیا جائے اور باہمی اتحاد سے دینی خدمت کو انجام دیا جائے۔

---

(۱) جس کو ماننا نہ ماننا میرے نزدیک دونوں برابر ہیں (۲) جب تک کوئی بات نہ ہو تو بلاوجہ کوئی کچھ نہیں کہتا (۳) بلاوجہ (۴) طوفان کھڑا کردیتے ہیں۔

نیز جناب رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد: (اِتَّقُوْا مَوَاضِعَ التهم)(۱) کا مقتضا بھی یہی ہے۔ البتہ جو شخص چندہ وغیرہ سے آزاد ہو اور کسی قسم کی پروا نہ رکھتا ہو اُس کو اس رفع شبہات کی بھی ضرورت نہیں۔ کیونکہ عوام اگر اُس سے بدظن ہوں گے تو چندہ بند کرلیں گے۔ تو اس کو کچھ ضرورت ہی نہیں۔ اس کو نہ اشتہار بازی کی حاجت ہے نہ جلسوں کی ضرورت ہے بلکہ وہ تو عیش وعشرت کے ساتھ اپنی زندگی کے ایام کو بسر کرے گا۔

مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا مدرسہ

مثلاً حضرت مولانا گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ تھے کہ تعلیم و تدریس کا کام تو وہاں مدرسوں سے زیادہ ہوتا تھا۔ خوردونوش کا انتظام بھی خوب اچھی طرح تھا لیکن مولانا کو کسی کی اعانت کی پروا نہ تھی۔ گو اہل خیر بطور خود طلبہ کی خدمت کرتے تھے لیکن مولانا نے کبھی صراحۃً یا کنایۃً طلب نہیں فرمایا۔ اب کوئی شخص مثلاً یہ مشہور کردیتے کہ مولانا ایک ہزار روپیہ کھا گئے یا مولانا نے فلاں مال نعوذ باللہ غبن کرلیا تو مولانا کو اس کے دفعیہ کی ضرورت نہ تھی گو طبعی کلفت ضروری ہوتی۔ لیکن کسی مصلحت کا بھی یہ اقتضا نہ ہوتا کہ کسی جلسہ سے یا کسی اشتہار سے اپنی برأت ظاہر فرماتے کیونکہ آپ کسی ضابطہ کے پابند نہ تھے۔ بلکہ خرچ کے خود مختار تھے جس طرح چاہا خرچ کردیا۔ اگر تحریک چندہ کرتے لوگوں کے سامنے دست طلب دراز فرماتے تب تو حضرت کو ان قیود کا لحاظ ضروری تھا۔ اور جب بالکل استغنا سے کام لیا جائے تو کیا وجہ کہ اس معاملہ میں اظہار صورت حاجت کیا جائے۔ یہی حضرت کا احسان تھا کہ جو لوگ حبۃ اللہ طلبہ کی خدمت کرتے تھے حضرت اس کے بذل (۲) وحفاظت کی مشقت اٹھاتے

(۱) تہمت کے موقع سے بچو (۲) اس کے خرچ کرنے اور حفاظت کی ذمہ داری اٹھاتے تھے۔

تھے۔ اب جس کو شبہ ہو مت دو کوئی مانگنے نہیں آتا اپنے گھر جاؤ آرام کرو۔

اختلاف دور کرنے کے لئے کمیٹی کا قیام اور اس کی ذمہ داری

باقی رہا وہ شخص جس کی طرز وروش ایسی نہ ہو بلکہ وہ ضوابط وقواعد کا پابند ہو، اشتہار و جلسہ سے کام لیتا ہو اس کو بحیثیت اجتماع ومصلحت دینی بے شک ضرورت ہے کہ اپنی صفائی کی تدبیر کرے اور اس کی ایک اچھی صورت یہ ہے کہ ایک ذی اثر لوگوں کی جماعت جو عمائد شہر سمجھے جاتے ہوں اور جن میں علماء بھی ہوں طرفین کو جمع کریں۔ یعنی وہ لوگ بھی ہوں جنہوں نے اختلاف کیا ہے اور وہ بھی ہوں جن سے اختلاف کیا ہے اور علماء سے مراد یہ نہیں ہے کہ میں بھی اس کمیٹی میں شامل ہوں کیونکہ نہ تو میں عالم ہوں اور نہ میں اپنے واسطے اس قسم کے فیصلے پسند کرتا ہوں ۔ وَلِلنَّاسِ فِی مَا یَعْشِقُوْنَ مَذَاهِبُ (۱)

اور اس مجمع میں یہ کوشش نہ ہو کہ ہماری برأت ہی ہو جاوے بلکہ اصلی واقعات کو من وعن بیان کر دینا چاہئے ۔ اس کے بعد اگر اس جماعت کی نظر میں شبہات دور ہو جاویں فبہا ورنہ کام سب ان ہی کے سپرد کر دیا جاوے اور خود دست بردار ہو جاویں کہ لو تم جانو تمہارا کام۔ جس کو چاہو سپرد کر دو۔ کیونکہ دین کا کام کسی شخص خاص کی ذات پر موقوف نہیں ہے۔

مہتمم مدرسہ کی حیثیت

مہتمم مدرسہ مسلمانوں کا وکیل ہوتا ہے اور وکالت کی وجہ سے مسلمانوں کی دینی خدمت کو انجام دیتا ہے اور چونکہ مؤکل کو عزل وکیل کا اختیار ہوتا ہے اس لئے عامہ مسلمین کو کہ جن کا یہ وکیل ہے اس کے عزل کا اختیار ہے۔ اس میں وکیل کا کچھ

(۱) لوگوں کو اپنی اپنی پسند ہے۔

زور نہیں۔ جیسے مقدمہ کی پیروی کے واسطے وکیل و بیرسٹر مقرر کئے جاتے ہیں۔ جب چاہتے ہیں اس کو معزول کر دیتے ہیں اور دوسرا وکیل بنا لیتے ہیں۔ تو کیا کسی عدالت کے وکیل کو اس امر کا حق ہے کہ وہ سر ہو جائے اور کہے میں ہی وکیل ہونگا ہرگز نہیں! بلکہ وہ حساب صاف کر کے کہے گا کہ جہاں تمہارا جی چاہے جاؤ۔ اسی طرح مہتمم مدرسہ عامہ مسلمین کا وکیل ہے اور جناب اگر انسان اتنی ہمت کرے تو خود بخود شبہات سے برات ہو جاتی ہے۔ پھر لوگ اس کو نہیں چھوڑتے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا طرز عمل

چنانچہ جس زمانہ میں میں کانپور کے مدرسہ میں تھا وہاں کے لوگوں نے اہل مدرسہ پر کچھ اعتراضات شروع کئے۔ میں نے جواب میں نہ وعظ کہا نہ اشتہار بازی کی، نہ جلسہ کیا بلکہ عمائد مدرسہ کو بلا کے کہا کہ صاحبو! معترضین کے اتفاق سے معلوم ہوا کہ ہم لوگ خدمت مدرسہ کے اہل نہیں ہیں اور خدمت ہمارے حال کے مناسب نہیں۔ اس لئے ہم مدرسہ سے جاتے ہیں آپ جو انتظام چاہیں کریں۔ مدرسہ کا مکان و موجودات و تحویل وغیرہ سب دیکھ لیجئے۔ جناب اُسی جلسہ میں سب اعتراضات وغیرہ رخصت ہو گئے مگر یہ کوئی ترکیب نہیں ہے بلکہ دل میں بھی یہی ہونا چاہئے کہ اگر کام ہم سے لے لیا جاوے گا تو ہم دل سے راضی رہیں گے۔

مشورہ

حاصل یہ ہے کہ جو لوگ نیا مدرسہ کرنا چاہتے ہیں ان کے واسطے تو یہ رائے ہے کہ وہ تبدد و تفرق (۱) سے کام نہ لیں اور قدیم مدرسہ والوں کی بابت یہ رائے ہے کہ وہ اپنے اوپر سے شکوک و شبہات کو رفع کر دیں (۲) اور اس میں حکم ذی اثر

(۱) اختلاف و افتراق سے کام نہ لیں (۲) دور کریں۔

رؤساء اور علماء ہوں(۱)۔ اس کا فیصلہ عوام سے معلق نہ ہونا چاہئے البتہ میں اس خدمت سے معذور ہوں کیونکہ میں نے اسی جھگڑے وغیرہ سے بچنے کے لئے کانپور کو چھوڑ دیا۔

مقصود مدارس

ایک مرتبہ تھانہ بھون میں بعض رؤساء کی یہ رائے ہوئی کہ ایک جدید مدرسہ امداد العلوم کے مقابلہ میں قائم کیا جائے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب چاہو نیا مدرسہ کرلو۔ میں پرانے مدرسہ کو بند کردوں گا۔ مقصود نشر ہے دین کا جس کے ہاتھ سے بھی ہو۔ ایسی حالت میں ایک مدرسہ کیا سو مدرسے بھی ہوجائیں تو کچھ حرج نہیں کیونکہ ہم کو جلب مال مقصود نہیں تاکہ یہ مدرسے اس میں مخل ہوں۔ سو دوسرے مدرسے والوں کا مقصود یہ تھا کہ پہلا مدرسہ نیست و نابود ہوجائے لیکن میرے اس طرز عمل کا اثر یہ ہوا کہ وہی لوگ بیٹھ رہے اور اپنے قصد سے باز رہے(۲)۔

ایک مرتبہ مجھے ایک شخص نے پانچ روپے بھیجے تھے کہ طلباء سے دُعا کراؤ۔ میں نے روپے واپس کردیئے کہ مدرسہ دُعا کی دکان نہیں ہے اور اس طرز میں عزت دین کی ہے اور عزت دین ہی کی مقصود بالذات ہے اور یہی مدرسہ کی روح ہے پس اصل بقاء دین کا چاہئے خواہ مدرسہ رہے یا نہ رہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی حصول چندہ میں احتیاط

ایک مرتبہ ایک رئیس نے میرے پاس مدرسہ کے لئے دوسو روپیہ بھیجے اور لکھا تھا کہ میں جناب کو لینے آؤں گا۔ میں نے لکھا کہ میں یہ روپیہ اس وجہ سے نہیں لینا چاہتا کہ مجھ کو اس مضمون سے شبہ پڑ گیا کہ روپیہ بھیج کر مجھ پر شاید اثر ڈالا جاتا

(۱) فیصلہ کرنے والے بااثر صاحب ثروت اور علماء کی جماعت ہو (۲) ارادے۔

ہو تو اس میں ایک گونہ رشوت کا شائبہ ہے اگر بلانا ہے تو بلانے کے بارے میں مستقل گفتگو کیجئے اور روپیہ وصول نہیں کیا تو اس کا جواب معذرت سے بھر آیا کہ آپ مدرسہ کے لئے روپیہ لے لیں اور میں نہیں بلاتا۔ پھر مدت کے بعد مستقلاً انہوں نے بلایا۔

ایسے ہی ایک شخص پانی پت سے آئے اور انہوں نے پندرہ روپیہ مدرسہ میں داخل کرنا چاہا۔ میں نے ان سے سوال کیا تم نے پانی پت کے مدرسہ میں یہ روپیہ کیوں داخل نہیں کیا۔ معلوم ہوتا ہے تم نے یہ سمجھا کہ ثواب کا ثواب ہوگا اور وہ شخص بھی یعنی احقر خوش ہوگا۔ کہنے لگے جی ہاں بات تو یہی تھی۔

چہ خوش بود کہ بر آید بیک کرشمہ دوکار (۱)

ایک پنتھ دو کاج۔ میں نے روپے واپس کر دیئے اور کہا کہ میں شرک کی رقم نہیں لیتا جس میں ارضاء حق کے ساتھ ارضاء خلق بھی مقصود ہو(۲) دوسرے دن انہوں نے کہا، اب وہ نیت نہیں ہے۔ اب صرف ثواب محض کی نیت ہے، لے لیجئے۔ میں نے لے لئے۔

مخالفین میں صلح کرانے کا طریقہ

غرض جو شخص آزاد ہو وہ کسی کے جھگڑے میں کیوں پڑے گا۔ اس لئے ایسے شخص کو چھوڑ کر دوسرے اہل اثر اہل علم جمع ہو کر باہم گفتگو کر لیں اور اس میں بڑی ضروری بات یہ ہے کہ اہل معاملہ کی دونوں جماعتیں فیصل کنندوں کے سامنے

---

(۱) کیا خوب کہ ایک بات سے دو کام نکل آئیں (۲) جس میں اللہ کی رضاء کے ساتھ مخلوق کی رضاء بھی شامل ہو تو یہ شرک کی صورت بنتی ہے۔

رو برو گفتگو کریں۔ ورنہ روایتوں حکایتوں میں اور قصہ بڑھ جاتا ہے فیصلہ تو کیا ہوتا اور مخالفت زیادہ ہوجاتی ہے۔ دوسرے ایسے قصوں میں ایک ثالث کی ضرور احتیاج ہوتی ہے کیونکہ فریقین خود شبہات نہیں رفع کرسکتے اور نہ خود متفق الرائے ہوسکتے ہیں۔ اول تو لوگوں کو اپنی غلطی نہیں معلوم ہوتی۔ دوسرے ہر شخص کی فطرۃً ایک آن ہوتی ہے۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنی غلطی سے واقف ہوجاتا ہے لیکن نفس پروری اقرار حق میں آڑ بن جاتی ہے۔ لہذا ایک ثالث جماعت فیصلہ کردے اور طرفین اُس کو مسلم سمجھیں اور اس کے فیصلہ کے موافق عمل درآمد کریں۔ میری یہ رائے ہے اور اس سے اچھی صورت میرے ذہن میں نہیں ہے۔ ممکن ہے اور کوئی صاحب اس سے بہتر تجویز کردیں۔

تو پہلا مضمون ذہن میں تعدد کا تھا جس کی مثال مساجد سے واضح ہوگئی مگر صورت واقعہ سے ممکن ہے کہ اس وقت تعدد کا نتیجہ اچھا نہ ہو۔ لہذا اب پہلے مضمون کی جگہ پر دوسرا مضمون شروع کیا گیا۔ کیونکہ واقعات سے رائے بدل گئی ہے۔

اتفاق کی صورت وحقیقت

حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ ترجمہ اس کا یہ ہے کہ تم سب لوگ مل کر دین اللہ کے ساتھ تمسک کرو(۱)۔ اور سب کے سب دین پر قائم رہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل مقصود دین ہے۔ اتفاق بھی وہی مطلوب ہے جو تمسک بالدین کے ساتھ ہو۔

آج کل کے عقلاء نے صرف اتفاق کا نام سن لیا ہے اور اُسی کی رٹ میں رات دن مصروف رہتے ہیں۔ اور اُن کے نزدیک اتفاق کے معنی صرف یہ ہیں کہ

(۱) مضبوطی سے تھام لو۔

ایک شخص دوسرے کا ہم خیال ہوجائے کہ جو شخص حق کو چھوڑ کر باطل پرست (۱) کے ساتھ ہوجائے وہ بھی اتفاق سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ کوئی صحیح العقل اس کا طالب نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح کا اتفاق برادری کا اتفاق ہے۔ مثلاً ناچ برابر کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ بُرا بھی سمجھتے ہیں۔ اگر منع کرو تو کہتے ہیں کیا کریں برادری تو نہیں بگاڑی جاتی۔ خلاف وضع کیسے کریں۔ بزرگوں کا طریقہ چلا آرہا ہے۔ تو ایک اتفاق یہ بھی ہے۔

قرآنِ پاک نے فیصلہ کردیا کہ اتفاق مطلقاً مطلوب نہیں بلکہ اتفاق کے خاص فرد کی طلب ہے یعنی باطل حق کے ساتھ نہ ہو اور عکس کی صورت مطرود (۲) ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ عزاسمہ نے اِجْتَمِعُوْا نہیں فرمایا بلکہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا (۳) فرمایا کہ وہ اتفاق مطلوب ہے جس میں زمامِ دین (۴) ہاتھ سے نہ چھوٹے اور اس کی پوری توضیح (۵) مثالوں سے ہوجاتی ہے۔

مثلاً دو سلطنتوں میں جنگ ہو اور بازار قتل گرم ہو۔ اب بہی خواہان قوم کیا اتفاق اتفاق وہاں بھی پکاریں گے اور اتفاق کی صورت یہ تجویز کریں گے کہ ایک سلطنت بلا کسی ترجیح کے اپنی حکومت سے دست بردار ہوجائے اور دوسری سلطنت بانیل ومرام (۶) واپس پھرے۔ تو کیا یہ اتفاق ہے؟۔

یا ایک ظالم شخص ایک مظلوم سے لڑنے لگے۔ اب یہاں اتفاق کی صورت ایک یہ بھی ہے کہ مظلوم محض ساکت کھڑا پٹتا رہے تاکہ اتفاق ہاتھ سے نہ جائے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ اتفاق نہیں بلکہ اتفاق مطلوب کے معنی یہ ہیں کہ ظالم اس فعل شنیع سے (۷) باز رہے اور مظلوم کے ساتھ اتفاق کرے۔ نہ کہ مظلوم بیچارہ مصیبت میں

(۱) حق کو چھوڑ کر باطل پوجنے والے کے ساتھ (۲) متروک ہے (۳) جمع ہونہیں کیا (۴) دین کی لگام (۵) وضاحت (۶) کامران وکامیاب ہوکر (۷) برے کام۔

مبتلا رہے۔

ان سب باتوں سے روزِ روشن کی طرح واضح ہوگیا کہ مطلق اتفاق مطلوب نہیں بلکہ مطلوب ومرغوب فیہ(۱) وہی اتفاق ہے جس میں ناحق کو حق کے تابع کیا جائے نہ کہ بالعکس(۲)۔ لہذا یہ عنوان کہ آپس میں اتفاق سے رہو نہایت ہی مہمل عنوان ہے۔ اول تعیین حق کی ضرورت ہے اس کے بعد جو ناحق پر ہو اس سے فہمائش کی جائے۔ کہ اہل حق کے ساتھ متفق ہوکر رہے نہ کہ علی الاٹکل اتفاق اتفاق پکارنا شروع کردے۔

اتفاق کی ناپسندیدہ صورت

مثلاً ایک ڈپٹی مقدمہ پیش ہونے کے وقت کسی بے جرم کو کسی مجرم کے ساتھ متفق ہونے کا حکم دے تو یہ اتفاق کس درجہ تک صحیح ہوگا۔ یا ایک شخص نے ایک لاکھ روپیہ کا دعویٰ کیا اور روداد سے (۳) حاکم کو یہ بھی معلوم ہوگیا کہ مدعا علیہ جھوٹا ہے اور اس کے ذمہ ایک لاکھ روپیہ واجب الادا ہے لیکن وہ فدائے قوم اپنے اتفاق کی دُہن میں مدعی کو ڈگری دلانے کی بجائے یہ کہے کہ تم ایک لاکھ روپیہ چھوڑ دو اور آپس میں مخالفت نہ کرو۔ اتفاق سے رہو تو کیا یہ اتفاق ہے۔ ہرگز نہیں! جہاں قانون میں اور جرائم ہیں کیا مطلق نااتفاقی بھی کہیں جرم ہے۔ اگر نااتفاقی جرم ہے تو خاص نااتفاقی ہی جہاں ناحق حق سے نااتفاقی کرے اور باطل حق کے مقابلہ میں اپنی بے جا کارروائی سے باز نہ رہے بلکہ اس قسم کے اتفاق سے فیصلہ کرنا خود بہت بڑا جرم ہے۔ کیوں کہ مغلوب کا دبانا اور مظلوم کو ستانا عدالت میں بہت سنگین جرم ہے۔

(۱) پسندیدہ اتفاق (۲) ناحق کو حق کے تابع کردیا جائے یہ نہیں کہ حق کو ناحق کے تابع کردیں (۳) تفصیلات سے۔

مطلق اتفاق پسندیدہ نہیں

حاصل یہ ہے کہ مطلق اتفاق محمود نہیں بلکہ بعض افراد اتفاق کے ناجائز ہیں اور ہمارے عقلاء اس سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ مثلاً دو مولوی آپس میں لڑتے ہیں اور ایک دوسرے کا ترکی بترکی جواب دیتے ہیں۔ اب اس میں کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ ایک ایک من ایک سو امن۔ اور بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک بالکل خاموش ہے لیکن دوسرا اشتہار بازی کرتا ہے۔ اخباروں میں بیہودہ اور غیر موزوں مضامین شائع کراتا ہے۔ وعظ وغیرہ کے جلسوں میں لاف اور گزاف سے کام لیتا ہے(۱)۔ اب حیرت ہے عقلاء سے کہ دونوں کو برا کہتے ہیں نااتفاقی کا الزام دونوں پر عائد کرتے ہیں۔ حالانکہ ایک بالکل ساکت ہے اب یہ کیا کرسکتا ہے۔ اپنا بولنا اس کے قبضہ میں تھا اس کو چھوڑ دیا۔ اب دوسرے کو تو بند نہیں کرسکتا۔ اس پر الزام لگانے کے کیا معنی۔ اول ناحق اور حق کی تحقیق کرو۔ پھر جو حق پر نہ ہو اس کو دباؤ۔

دیکھو ایک شخص عدالت میں مقدمہ دائر کرے اور خیر سے جج صاحب مصلح قوم اور لیڈر بھی ہوں اور اتفاق سے لیکچرار بھی ہوں لیکن بحیثیت جج کے مدعی سے کبھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں تیرا دعویٰ نہیں سنتا۔ جاؤ مخالفت نہ کرو متفق ہو کر رہو۔ میرا دماغ پریشان کرنے کو کیوں آئے ہو۔ میں تمہارا مقدمہ خارج کرتا ہوں۔ کیونکہ تم نااتفاقی کے مرتکب ہو۔ اگر وہ ایسا کرے، تو دیکھئے حکام بالا کی طرف سے ایسی صلح کی کیسی گت بنتی ہے۔ سو مصلح کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مطلق اتفاق پر عمل کرو بلکہ یہاں پر اصلاح یہی ہے کہ تحقیق کر کے حق دار کا حق ادا کرو۔ یعنی حکومت سے کام لو کاذب(۲) کو سزا دو۔ اُس سے ڈگری دلواؤ۔ قرقی وغیرہ کراؤ تاکہ آئندہ وہ اس

(۱) بے ہودہ بکواس کرتا ہے (۲) جھوٹے۔

نااتفاقی کا مرتکب نہ ہو۔ سو کیا کوئی ایسا شخص ہے جو ایسے مصلح کو یہ کہہ سکے کہ وہ صحیح الدماغ نہیں۔ کیونکہ اُس نے نااتفاقی کی معاونت کی ہرگز نہیں۔ کیونکہ یہ شخص اگرچہ اتفاق کو زبان سے نہیں نکالتا لیکن عملاً اتفاق کررہا ہے۔

آج کل کے مدعیان اتفاق کا حال

مجھ کو آج کل کے بہی خواہانِ قوم کے اتفاق پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک صاحب پٹ رہے تھے لیکن کبھی کبھی قابو پا کر ایک آدھ دھول (۱) مار بھی دیتے تھے۔ اُن کے دوست رفیق تشریف لائے اور دوست صاحب کا دست مبارک (۲) پکڑ لیا کہ اب اچھی طرح سے مرمت ہوجاوے۔ کسی نے پوچھا یہ کیا حرکت تھی۔ کہنے لگا ؎

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست

دوست وہ ہے جو مصیبت کے وقت دوست کے کام آئے۔

تو جس طرح انہوں نے دست گیری کے معنی سمجھے تھے ایسے ہی اتفاق کے معنی سمجھے جاتے ہیں۔ کیوں صاحب کیا اس دست گیر کو بھی حامی اتفاق سمجھا جائے گا کیوں کہ اختلاف رفع کرنے کی ایک صورت تو یہ بھی تھی تو جناب اگر یہی اتفاق ہے تو خدا خیر کرے اور ہمارا تو ایسے اتفاق کو سلام ہے۔

چنانچہ قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قصہ میں ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو خطاب کیا ہے۔

﴿وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ (۳)

(۱) ایک آدھ تھپڑ مار دیئے (۲) ہاتھ پکڑ لیا (۳) سورۂ عنکبوت: ۲۵۔

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ تم نے جو خدا کو چھوڑ کر بتوں کو تجویز کر رکھا ہے پس یہ تمہارے باہمی دنیا کے تعلقات کی وجہ سے ہے۔ پھر قیامت میں تم میں ہر ایک دوسرے کا مخالف ہو جائے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا۔

دیکھئے ''مودۃ بینکم'' سے معلوم ہوا کہ بت پرستوں میں اتفاق تھا مگر انجام اُس کا دیکھئے کیا ہے کہ وہاں پر ایک کو دوسرے کی طرف سے لعنت اور پھٹکار ہوگی۔ تو کیا ابراہیم علیہ السلام نے اُن میں نااتفاقی ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ کیا مصلحان (۱) قوم کے پاس اس کا کچھ جواب ہے؟ اصول جدیدہ کے موافق تو کامل اتفاق چوروں اور ڈاکوؤں میں ہے یا اور جو بدمعاش طائفے (۲) ہیں کہ جان، مال، دین، آبرو گنوا (۳) کے ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔ لیکن آج تک کسی مصلح نے نہ تو کسی چور کو انعام دیا نہ کسی ڈاکو کو اتفاق کی وجہ سے رہا کیا۔ ہمارے مصلحان قوم کی ضرورت ہے کہ وہ اتفاق کی تقسیم کریں۔ اور ایک قسم کی تو رغبت (۴) دلا دیں اور دوسری قسم کے قلوب میں نفرت بٹھا دیں۔ جس اتفاق سے اصلاح ہوتی ہے وہی اتفاق ہے جس میں باطل کو حق کے تابع کیا جائے۔ ورنہ وہ اتفاق نااتفاقی سے بھی زیادہ برا ہو جائے گا۔

مثلاً کوئی مسلمان کسی کافر کے اسلام میں کوشش کرے لیکن مشیت ایزدی کامیاب نہ ہو سکے۔ تو کیا اتفاق کی وجہ سے یہ مسلمان ترک اسلام کہہ کر کافر ہو سکتا ہے ہرگز نہیں۔ اس اتفاق سے تو نااتفاقی ہی اچھی کہ مسلمان مسلمان تو رہے گا دوسری اور اتفاق چاہے رہے یا نہ رہے کوئی عاقل مسلمان ایسے اتفاق کو تجویز نہیں کر سکتا۔

---

(۱) لیڈران قوم (۲) بدمعاش گروہ (۳) عزت وغیرہ ضائع کر کے (۴) شوق پیدا کریں۔

مقام ازالہ وامالہ

دیکھئے بخل مذموم ہے(۱) لیکن مطلقاً نہیں بلکہ بعض افراد بخل کے مستحسن و محمود(۲) بھی ہیں۔ مثلاً معاصی میں (۳) خرچ کرنے سے بخل کرنا اچھا ہے۔ پس نہ سخاوت بجمیع افرادہ مستحسن ہے نہ بخل بجمیع افرادہ مستقبح (۴)۔ بلکہ ہر شے اپنے اپنے موقعہ اور اپنے اپنے محل میں اچھی ہے جیسے جرّاح (۵) ہوتا ہے ۔

درشتی ونرمی بہم دربہ است چورگ زن کہ جرّاح ومرہم نہ است(۶)

جرّاح کے دونوں فعل اصلاح ہی ہیں ۔ کوئی شخص جرّاح سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تو پھوڑے میں شگاف مت لگا۔ اور مرہم ہی مرہم رکھے جا۔ مثلاً کسی کے ناسور(۷) ہوجاوے اور بغیر شگاف (۸) کے اچھا نہ ہوسکتا ہو۔ لیکن کوئی رحم دل مصلح قوم جراح کو شگاف نہ لگانے دیں کیونکہ بے رحمی ہے تو جرّاح اُس کا جواب یہی دے گا کہ ہر رحم دلی ہر سختی سے اچھی نہیں بلکہ بعض مقامات پر رحمدلی اچھی ہے اور بعض مواقع میں سختی اچھی ہے۔ تو اگر تمہارا مطلب یہ ہے کہ بعض افراد رحمدلی کے مستحسن ہیں تو ناسور کو شگاف نہ دینا۔ ان بعض میں سے نہیں ہے۔ یا کوئی رحم دل کہنے لگے کہ سانپ کو نہ ستاؤ۔ اللہ کی بے زبان مخلوق پر رحم کرو۔ بچھوؤں کو نہ مارو۔ شیر بھیڑیئے تیندوے کو کچھ نہ کہو۔ اگرچہ ہزاروں انسان ان ناگہانی بلاؤں سے فنا ہوجاویں لیکن تم بوجہ رحم کے اُن پر بندوق نہ ڈالو کیا اس کو کوئی شخص رحم کہہ سکتا ہے؟ اُس نے بظاہر تو سانپ وغیرہ پر رحم کیا لیکن اصل یہ ہے کہ اُس نے اُس قوم

(۱) کنجوسی بری چیز ہے (۲) بعض مقامات پر کنجوسی اچھی اور پسندیدہ بات ہے (۳) گناہ (۴) نہ سخاوت کی ہر قسم اچھی ہے نہ بخل کی ہر قسم بری ہے (۵) نشتر لگانے والا حکیم ڈاکٹر (۶) جرّاح کے دونوں کام بہتر ہیں زخم لگانا اور مرہم رکھنا (۷) پھوڑا (۸) بغیر چیرو ائے۔

پر جو اُن سے بدر جہا افضل ہیں بڑا ظلم کیا۔ یعنی انسانوں کی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ (۱) باقی نہیں رکھا حاصل یہ ہے کہ ہر شے میں مختلف مراتب ہیں اور ہر شے اپنے محل میں مستحسن اور غیر محل میں قبیح ہے (۲) (وَمِنْ ثُمَّ قِیْلَ وَضْعُ الشَیءِ فِی غَیْرِ مَحَلِّهِ ظُلْمٌ) (۳) ۱۲ جامع۔

شیخ کا کام

مرشدنا حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ شیخ رذائل کا ازالہ نہیں کرتا بلکہ اُن کا امالہ کرتا ہے (۴)۔ مثلاً بخل ایک بری صفت ہے تو وہ اس کو اُن مواقع کی جانب منصرف کردے گا۔ جہاں پر بخل کرنا مستحسن ہے (۵) مثلاً قمار سے شراب سے بخل (۶) ہونے لگے گا۔ اور جو مواقع حسنہ ہیں (۷) جیسے مدرسہ میں دینا، سائل کو دینا، مسجد وغیرہ میں دینا۔ یہاں پر بخل نہ ہوگا۔ حاصل یہ کہ سالک ہر شے کو اُس کے محل میں استعمال کرنے لگے گا۔ سو بخل سے بچنے کی ایک صورت تو یہ تھی کہ بخل کا مادہ بالکلیہ زائل کردیا جائے (۸)۔ اور ایک صورت یہ تھی کہ اُس کو اُس کے مواقع کی جانب مائل کردیا جائے (۹) اور یہ صورت سہل عمل ہے (۱۰)۔

امالہ کی خوبی

دیکھو ایک انجن ہو اور اُس کی اسٹیم خوب گرم ہو رہی ہو۔ پوری رفتار کی

(۱) انسانوں کی جڑ کاٹنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی (۲) ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھا جائے تو اچھی ورنہ بری ہے (۳) اسی لئے تو کہتے ہیں کہ غیر محل میں چیز رکھنا ظلم ہے (۴) بری خصلتوں کو بالکل ختم نہیں کرنا بلکہ ان کا رخ موڑ دیتا ہے (۵) ان مواقع کی طرف پھیر دیگا جہاں بخل کرنا پسندیدہ ہے (۶) شراب جوئے میں رقم خرچ کرنے میں بخل کریگا (۷) اچھی جگہیں (۸) مادہ بخل ختم کردیا جائے (۹) پھیر دیا جائے (۱۰) اسی صورت پر عمل آسان ہے۔

اُس میں بھاپ موجود ہو اور وہ اتفاق سے سب گاڑیوں کو لے کے دوسری جانب کو چل دے تو اُس کے روکنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اُس کی آتش (۱) بجھادی جائے اُس کی بھاپ کو نکالا جائے اور یہ بہت مشکل ہے کیونکہ بھاپ ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے شہور کی مسافت ایّام میں طے ہوجاتی ہے (۲)۔ یہ بیش بہاشئی ہے (۳) اس کی تضییع (۴) ہرگز گوارا نہیں ہونا چاہئے اور نیز اس میں وقت بھی زیادہ خرچ ہوگا۔ دوسری صورت اس انجن کی اصلاح کی یہ ہے کہ دوسری طرف اس کی کل (۵) پھیر دے۔ اس سے امالہ کی ترجیح ازالہ پر بخوبی واضح ہوگئی۔

بس جس طرح انجن کی بھاپ قابل قدر تھی اسی طرح انسان کے تمام اوصاف بھی قابل قدر ہیں کیونکہ حکمت سے پیدا ہوئی ہیں۔

لِاَنَّ اللّٰہَ تَعَالَی حَکِیْمٌ وَفِعْلُ اللّٰہِ الْحَکِیْمِ لَا یَخْلُوْ عَنِ الْحِکْمَۃِ	اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور حکیم کا کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا

اس لئے ان کا ازالہ نہ کرے بلکہ مصارف صحیحہ کی طرف منصرف کردے (۶)۔

عشق مجازی کا علاج

مثلاً گھلتا پگھلتا ہو۔ رات دن گریہ و بکا (۷) سے کام ہو۔ اب اس کی دو تدبیریں ہیں ایک تو ازالہ جس کا حال ابھی معلوم ہوگیا۔ دوسرا امالہ جس کو شیخ کامل تجویز کرے گا اُس محبت کو محبوب حقیقی کی جانب منصرف (۸) کردے گا۔ اور وہ گریہ وبکا (۹) اور ہموم وغموم سب خالق جل جلالہٗ کی یاد میں ہونے لگے گا۔

(۱) آگ (۲) مہینوں کا سفر دنوں میں مکمل ہوتا ہے (۳) قیمتی چیز ہے (۴) ضائع کرنا (۵) رخ (۶) صحیح موقع کی طرف پھیر دے (۷) دن رات روتا ہو (۸) پھیر دے (۹) رونا چیخنا۔

عاشقی گرزیں سروگر زاں سراست عاقبت مارا بداں شہ رہبر است

اس کا یہ مطلب نہیں کہ خوب نظر بازی ہوا کرے اور بالقصد اس حرام فعل کا ارتکاب کیا جائے۔ پھر بھی موصل الی اللہ ہے(۱) بلکہ مقصود یہ ہے کہ اتفاقاً اس درد بے درماں (۲) میں مبتلا ہوجائے تو شیخ اُس کو حق تعالیٰ کی ذات والا صفات کے ساتھ متعلق کردے اور اسی واسطے مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

متاب از عشق رو گرچہ مجازیست کہ آں بہر حقیقت کارسازی است (۳)

یعنی ازالہ کی حاجت نہیں بلکہ اُس کو محبوب حقیقی کی جانب مائل کردینا چاہئے۔

پس حاصل یہ ہے کہ جیسے ہر رحمدلی اچھی نہیں بلکہ بعض بے رحمیاں بھی اچھی ہیں اسی طرح مطلق اتفاق بھی محمود نہیں بلکہ بعض افراد نا اتفاقی کے بھی پسندیدہ ہیں۔ جیسے بعض افراد امساک (۴) کے مستحسن ہیں۔

شرک باللہ

دیکھو جب ہمارے سردار کا مگار(۵) آقائے نامدار(۵) تشریف لائے تمام عالم پر کفر کی گہنگور گھٹائیں (۷) چھائی ہوئیں تھیں۔ سب لوگ کافر تھے کیا آج روئے زمین پر کوئی ریفارمر کوئی لکچرار کوئی مصلح قوم، کوئی بہی خواہ قوم ہے جو یہ کہہ دے کہ جناب رسالتمآب ﷺ نے نا اتفاقی کی۔ کیونکہ ساری دنیا کے مقابلے میں آنحضور ﷺ نے لا الٰہ الا اللہ کا بآواز بلند نعرہ لگا کر زمین و آسمان کو گونجا دیا۔ ابھی اور احکام کے اظہار کی نوبت نہیں آئی تھی۔ صرف توحید ہی سے دنیا میں وحشت کے

(۱) اللہ تک پہنچنے والا (۲) لا علاج تکلیف (۳) عشق مجازی سے بھی منہ نہ موڑو کہ حقیقت تک پہنچنے میں بہت مفید ہے (۴) کنجوسی کرنے اور مال خرچ نہ کرنے کے پسندیدہ ہیں (۵) خوش قسمت سردار (۶) آقائے معروف یعنی حضور ﷺ (۷) گہری۔

آثار پیدا ہونے لگے تھے مشرکین مکہ کہتے تھے۔

اَجَعَلَ الاٰلِھَۃَ اِلٰھًا وَّاحِدًا کیا انہوں نے اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا۔

مشرک رحمدل بہت تھے۔ اللہ میاں پر رحم کھاتے تھے کہ ایک خدا کہاں کہاں کی خبر گیری(۱) کرے گا۔ اور کیا کیا کام کرے گا۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہ (۲) تھک جائے گا۔ اس وجہ سے اُس کے لئے خلیفہ اور نائب بنانا چاہئے کہ ایک کام کرے اور دوسرا آرام کرے۔ بیچاروں نے سلاطین دنیا پر قیاس کیا کہ جیسے یہ لوگ مقاصد مملکت میں بغیر اعانت غیرے(۳) کامیاب نہیں ہوسکتے اسی طرح خدا بھی اور چھوٹے خداؤں کا محتاج ہے

جیسے مثلاً جارج پنجم ہیں (۴)۔ ان کو پارلیمنٹ، کمشنر، کلکٹر، مجسٹریٹ، جج انسپکٹر وغیرہ کی ضرورت ہے۔ بیچاروں نے یہی سمجھا کہ علیٰ ہذا القیاس(۵) خدا بھی ماتحت حکام کا محتاج ہے۔ لیکن یہ خیال ان کا قیاس مع الفارق تھا(۶) اور خیر مشرکین تو کہا ہی کرتے تھے کہ بڑے بڑے کام تو اللہ میاں کرتا ہے اور چھوٹے چھوٹے کام اور دیوتا کرتے ہیں۔ حیرت ہے کہ بعض مسلمانوں میں اب تک ان مشرکین کے عقیدہ کا اثر چلا آتا ہے۔ چنانچہ اولیاء اللہ کو سمجھتے ہیں کہ خدمات تکوینیہ میں اُن کا دخل ہے اور یہ بالکل شرک ہے۔

مشرکانہ عقیدہ

کانپور میں ایک نو عمر احمد جان شخص تھے۔ محرم کے مہینہ میں مسجد میں

(۱) دیکھ بھال (۲) اللہ کی پناہ (۳) دوسرے کی مدد کے بغیر (۴) حکومت برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کا حکمران (۵) اس پر قیاس کرتے ہوئے (۶) ان کا یہ قیاس درست نہیں تھا۔

آرہے تھے۔ رستہ میں ایک بوڑھی عورت ملی اور کہا، بیٹا اس کھانے پر نیاز دے دو۔ انہوں نے پوچھا، بڑی بی! کس کی نیاز دے دوں۔ تو بڑی بی نے فرمایا کہ ہائیں! یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ بھلا عشرہ میں سوائے امام حسین علیہ السلام کے اور کسی کی نیاز بھی ہوتی ہے۔ ان دنوں میں تو اللہ میاں نے اپنی نیاز سے بھی منع کر دیا ہے۔

یہ مسئلہ بھی بڑی بی نے ہی گھڑا۔ یہ لوگ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کو ایسا سمجھتے ہیں جیسے پنشن یافتہ ڈپٹی کلکٹر کارکن۔ تو صرف صابر صاحب، خواجہ صاحب، معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ ہیں اور اللہ میاں برائے نام۔ تو خوب سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ یہ شرک باللہ ہے اور اس کی اصل وہی مشرکین کا عقیدہ ہے۔

مشرکوں کا حال

چنانچہ ایک مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مشرکین عرب سے دریافت فرمایا کہ تمہارے کتنے معبود ہیں۔ کہا سات۔ ایک نہ دو اکٹھے سات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، وہ کہاں ہیں؟ کہنے لگے ایک آسمان میں ہے اور چھ زمین میں ہیں۔ مہتم بالشان امور تو آسمان والے خدا کے متعلق ہیں اور چھوٹے چھوٹے کام زمین والے خدا کرتے ہیں۔

چنانچہ باری تعالیٰ مشرکین کے اس عقیدہ کو اس واقعہ میں نقل فرماتے ہیں:

﴿ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُاللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ (۱) ''جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارتے ہیں''

یعنی جب دریا میں سوار ہوتے تھے اور وہاں تلاطم امواج اور مدوجزر (۲) سے غرق کا خوف ہوتا تھا، تب تو خوب گڑگڑا کے دُعا مانگتے تھے کہ ﴿لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا

(۱) سورۂ عنکبوت: ۶۵ (۲) سمندری موجوں کے اتار چڑھاؤ سے کشتی ڈوبنے کا خوف ہوتا۔

مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ﴾(۱) ''مصیبت سے بچالیا، تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے''۔

کہ اے اللہ! اگر تو ہم کو اس بلا سے نجات دے اور ہم صحیح سالم منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے تو تیری شکر گزاری کریں گے'

﴿فَلَمَّا اَنْجٰهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الحق﴾ ''پھر جب خدا اُن کو بچالیتا ہے تو فوراً ہی وہ زمین میں ناحق سرکشی کرنے لگتے ہیں''

اور جب حق تعالیٰ نے ان کو نجات دے دی تو پھر ملک میں بلا کسی استحقاق کے سرکشی کرنے لگے۔

مسلمانوں کی حالت زار

ایک بہت ہی تعجب ہے کہ وہ لوگ مخادف (۲) میں تو اللہ ہی کو پکارتے تھے لیکن ہمارے بعض مسلمان ان سے بھی زیادہ بہادر ہیں۔ وہ ایسی حالت میں بھی غیر اللہ ہی کو پکارتے ہیں۔ چنانچہ میں نے خود سنا کہ جہاز کی حرکت کے وقت بعضے یا علی رضی اللہ عنہ کہتے تھے بعض خواجہ صاحب کو بلاتے تھے۔ حیرت ہوتی تھی کہ مشرکین تو ایسے وقت میں خدا کو پکارتے تھے لیکن یہ موحدین بزرگان دین کو پکارتے ہیں۔ بھلا یہ حضرات کیا کر سکتے ہیں۔ وہ تو خود حق تعالیٰ کے محتاج بندے ہیں۔

ایک شخص بیان کرتے تھے کہ مداری فقیروں کی ایک مجلس میں تذکرہ ہوا کہ دنیا کے کام کون کرتا ہے۔ تو یہ رائے پاس ہوئی کہ پہلے تو خداوند تعالیٰ کرتے تھے لیکن جب سے مدار صاحب (۳) ہوئے ہیں اب تمام دارومدار مدار صاحب پر

(۱) سورۂ یونس: ۲۲ (۲) سورۂ یونس: ۲۳ (۳) حالت خوف میں (۴) وہ شخص جس پر امور سلطنت کا مدار ہو یعنی وزیر اعظم۔

ہے۔ وہ دنیا کے کاموں کو انجام دیتے ہیں۔ اب غور کیجئے کہ آج کل کی کمیٹیوں میں ایسے ریزولیشن پاس ہوتے ہیں۔ یہ تو حالت ہے حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی۔

ایک دوسرے شخص بیان کرتے تھے کہ ایک شخص سے پوچھا گیا، تم کون لوگ ہو، کہا مسلمان، پھر دریافت کیا کس کی اُمت ہیں۔ کہا پچھان (۱) میں ایک راجہ گجرا ہے (گزرا ہے)۔

اب دیکھئے یہ بیچارہ جناب حضور ﷺ سے اس قدر ہی تعلق رکھتا تھا کہ پچھان کا راجہ سمجھتا تھا۔ پچھان مدینہ کو اس وجہ سے کہا کہ ہندوستان سے حجاز مغرب کی سمت واقع ہے۔ ایسے لوگوں کی حالت سن سن کر بہت رحم آتا ہے کہ بیچارے کیسے دامِ جہالت میں گرفتار ہیں۔ بادیہ ضلالت (۲) میں گمراہ ہیں۔ حق تعالیٰ ان کی رہبری فرمادیں۔ اور صراطِ مستقیم پر لائیں۔

علماء کا حال

مگر اس سے زیادہ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ہمارے واعظین وعلماء میں سے کوئی حضرت بھی ایسے اطراف جوانب میں نہیں پھرتے۔ جہاں ضرورت نہیں وہاں تو رات دن علماء کا گزر رہتا ہے اور جس جگہ واقع احتیاج ہے وہاں ہُو کا عالم ہے (۳)۔ جو کچھ قوت وطاقت ہے آپس کی لڑائیوں میں صرف کرتے ہیں سب سامان خانہ جنگیوں میں ختم ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ اپنی متفقہ طاقت سے اہل اسلام سے جہل دُور کریں۔ آفتاب اسلام کو عروج دیں۔ حضیض ذلت سے نکل کر اوجِ عزت پر پہنچیں (۴)۔ نہ یہ کہ اور پستی کے اسباب پیدا کئے جائیں اور جہلا کی

(۱) مغرب میں (۲) گمراہی کی وادیوں میں بھٹک رہے ہیں (۳) خوف کی فضاء ہے (۴) ذلت کے گڑھوں سے نکل کر عزت کی بلندیوں کو چھوئیں۔

اصلاح تو درکنار علماء کو بھی اپنی غیبت اور ہیجا اور ناشائستہ بداخلاقیوں کا ہدف بنایا جائے(۱)۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ؎

شنیدم کہ مردانِ راہِ خُدا دلِ دشمناں ہم نہ کردند تنگ

میں نے سنا کہ خدا کے راہ پر چلنے والے مرد، دشمنوں کے دلوں کو بھی تنگ نہیں کرتے۔

مگر ہماری یہ حالت ہے کہ ؎

ترا کے میسر شود ایں مقام کہ بادوستانت خلاف ست وجہ جنگ

تجھے یہ مقام کب حاصل ہوسکتا ہے کہ تو دوستوں کے خلاف لڑائی کرتا ہے۔

خیر یہ جملہ تو بطور تفریع کے تھا لیکن اتنی بات اور سمجھنے کے قابل ہے کہ جہل عذر و حجت نہیں ہوسکتا۔

حضور ﷺ کے زمانے میں موجود باطل مذاہب

اس سے قبل میں حضور ﷺ کا قصہ بیان کررہا تھا کہ آپ ﷺ نے جب توحید کا دعویٰ کیا تو تمام آپ ﷺ کے مخالف تھے کیونکہ نصاریٰ تو تثلیث کے قائل تھے۔ اقانیم ثلثہ (۲) مانتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خدا اور خدا کا بیٹا مانتے تھے۔ یہود عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے تھے۔ مجوس لوگ اہرمن و یزداں کے قائل تھے خالق شر اہرمن ہے (۳) اور خالق خیر یزداں ہے (۴)۔

---

(۱) جہلاء کی اصلاح تو کیا کرتے ہیں بلکہ علماء کی برائی بدگوئی کرتے ہیں اور ان سے بداخلاقی سے پیش آتے ہیں (۲) تین خدا مانتے تھے (۳) برائی پیدا کرنے والا خدا اہرمن ہے (۴) خیر پیدا کرنے والا یزداں ہے۔

فارس میں آتش پرستی کا غلغلہ بلند تھا۔ ہندوستان میں وثن پرستی کا بازار گرم تھا۔ بعض شمس وقمر کو معبود حقیقی سمجھتے تھے۔ بعض خدا ہی کے منکر تھے اور اس سلسلۂ عالم کو بغیر موجد کے قیام پذیر بتاتے تھے یعنی جو لوگ دہریہ کہلاتے ہیں جیسے فرعون بھی دہریہ تھا۔ حضور ﷺ کے زمانے میں بھی موجود تھے۔ غرضیکہ تمام دنیا پر شش جہت سے بحر کفر کی طغیانی تھی (۱) اور کوئی ناخدا نہ تھا (۲) جو گرداب ہلاکت (۳) سے کشتی کو کنارہ پر پہنچاتا۔ سب لوگ منجدھار میں پھنسے ہوئے تھے کہ حضور ﷺ پر اِقْرَا بِاسْمِ کی ابتدائی تین آیتیں نازل ہوئیں۔ پھر تین سال تک متواتر وحی کا سلسلہ منقطع رہا جس سے حضور ﷺ پر قبض احوال طاری (۴) رہا اور آپ ﷺ نے بہت کوفت اٹھائی۔ چنانچہ ایک مرتبہ خودکشی کا (۵) قصد فرمالیا تھا۔ بحکم خداوندی جبرئیل علیہ السلام سدِ راہ ہوئے (۶)۔

غرضیکہ تین سال بعد اور قرآن شریف نازل ہوا۔ چونکہ پہلی وحی میں تبلیغ کا حکم نہ تھا اور خدا کا نام لینا تو ہمیشہ سے حضور ﷺ کے لئے لابدی امر تھا (۷)۔ تو اب تک یہ کیفیت تھی کہ جناب فخر عالم ﷺ کا کوئی منکر نہ تھا بلکہ سب لوگ آپ ﷺ کے تقدس اور کریم النفس (۸) ہونے کے قائل تھے۔ آپ ان لوگوں کے مقدمات میں حکم بن کر فیصلہ فرماتے تھے سب آپ ﷺ کی امانت داری کی صفت کے معتقد تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ کو محمد ﷺ الامین کہا کرتے تھے۔

کفار کا حضور ﷺ کو حَکَم بنانا

ارہاس (۹) کے زمانہ کا ایک عجیب وغریب واقعہ ہے کہ قبائل عرب نے جب

(۱) چھیؤوں جہتوں سے کفر کے سمندر کی لہریں اٹھ رہی تھیں (۲) کوئی ملاح نہ تھا (۳) ہلاکت کے بھنور سے (۴) قبض کی حالت طاری رہی (۵) خود کو پہاڑ پر سے گرانے کا ارادہ کرلیا (۶) اللہ کے حکم سے جبرئیل نے اس ارادے سے باز رکھا (۷) لازمی بات تھی (۸) ذاتی بزرگی (۹) نبوت سے قبل جبکہ آپ کو سچے خواب آتے تھے اس زمانے کا۔

خانہ کعبہ کی مرمت کی تو حجر اسود کے اٹھانے کے وقت بہت جھگڑا ہوا۔ کہ اس کو اس کے محل میں (۱) کون چسپاں کرے۔ سب لوگ رئیس وعمائد تھے اور ہر شخص کا قصد یہی تھا کہ میں اس سرخروئی سے مشرف ہوں۔ قریب تھا کہ آپس میں کشت وخون ہوجائے اور شمشیر بے نیام ہوجائے (۲)۔ کیونکہ قبائل عرب میں بوجہ جہالت وضلالت (۳) کے قتال کوئی بڑا کام نہ تھا ان کے ہاں تو موروثی جنگیں چلی آتی تھیں۔ خیر اُن کو ایسے جوش وخروش کے وقت یہ سوجھی کہ آپس میں مشورہ کر کے فیصلہ کرلو۔ تعجب ہے کہ ایسی جنگجو قوم کا ایسے موقعہ پر کیسے اتفاق ہوا۔

غرض کہ وہ لوگ حجر اسود کو چھوڑ کر ایک علیحدہ مقام پر مجتمع ہوئے اور یہ بات قرار پائی کہ مسجد حرام میں جو شخص سب سے اول داخل ہو، وہی ہمارا اس قضیہ میں حکم ہے اور اُسی کے فیصلہ کے موافق ہم لوگ عمل کریں گے وہ جس فریق کو تجویز کردے گا وہی اُس کو اٹھائے گا۔ اور فریق ثانی کو کچھ چون وچرا (۴) کا حق حاصل نہ ہوگا۔

اس سے اُن لوگوں کا باوجود کفر کے توکل معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ پر کیسے معتمد تھے کہ اول جو شخص داخل ہوگا وہ حکم بننے کے بھی قابل ہوگا۔ ایک آج کل ہمارا زمانہ ہے کہ باوجود اسلام کے توکل تو مفقود ہے لیکن اُس کی جگہ تاکل موجود ہے (۵)۔ چنانچہ ہر بات میں پالیسی حکمت عملی تلاش کی جاتی ہے سادگی بھولا پن، خلوص، اخلاص ناپید ہوگئے۔ یہ اوصاف حسنہ تو قدیم ہی لوگوں میں تھے۔ اب تو ایسے لوگوں کو احمق وبے وقوف سمجھا جاتا ہے۔ مگر خوب سمجھ لو آج کل کے لوگ عاقل

---

(۱) اس کی جگہ پر کون رکھے (۲) تلواریں نکل آئیں اور قتل وخونریزی شروع ہوجائے (۳) گمراہی (۴) کسی اعتراض کا حق نہیں ہوگا (۵) اللہ بر بھروسہ تو ہے نہیں ہر ایک کو اپنے پیٹ بھرنے کی فکر ہے۔

نہیں آکل ہیں (۱) بلکہ باقل ہیں (۲)۔ اب تو صرف ظاہری نمائش وتزئین رہ گئی ہے۔ غرض کہ قدیم زمانے میں کفار مشرکین تک بھی متوکل تھے۔

خیر سب سے اول مسجد حرام میں جناب رسول مقبول ﷺ ہی رونق افروز ہوئے۔ سب لوگ چلا اٹھے کہ

جاء محمد ﷺ الامین۔۔۔۔ جاء محمد ﷺ الامین

کہ محمد ﷺ الامین تشریف لے آئے۔ حضور ﷺ کو دیکھ کر سب لوگوں نے خوشی کی اب انصاف خوب ہوگا اور سب لوگ آپ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوگئے کہ ہمارا قلب بھی یہی چاہتا تھا کہ جناب تشریف لائیں اور آپ ہی ہمارے اس قضیہ کے حکم ہوں۔

حضور ﷺ کا منصفانہ فیصلہ

یہ ایک ایسا عجیب واقعہ تھا کہ جس کے فیصلہ کرنے میں بڑے بڑے عقلاء بھی چکرا جاتے۔ کیونکہ جس فریق سے اٹھوائیں دوسرا فریق مدمقابل ہو جائے اور کہنے لگے اُس فریق کی طرفداری کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک چادر لگاؤ اور چادر میں حجر اسود کو رکھ لو۔ پھر سب لوگ مل کے چادر کے کونے پکڑ کے خانہ کعبہ تک لے چلو اور میں تمہارا سب کا وکیل ہو جاؤں۔ میں چادر میں سے اٹھا کر خانہ کعبہ میں رکھ دوں گا اور چونکہ وکیل کا فعل مؤکل کا فعل ہوتا ہے۔ اس لئے وہ تم سب کا فعل ہو جائے گا۔ چنانچہ سب راضی ہوگئے اور آپ ﷺ نے اس طرح حجر اسود خانہ کعبہ میں رکھ دیا اور سب نزاع وفساد رفع ہوگیا (۳)۔

(۱) کھانے والے (۲) صرف کھانے والے نہیں بلکہ یہ ایسے ہیں کہ لوہے کی طرح اس کو کھالیں (۳) سب جھگڑا فساد ختم ہوگیا۔

حقیقی اتفاق

تو دیکھو کفار کے قلوب میں حضور ﷺ کی یہ عقیدت وعظمت تھی لیکن جب آپ ﷺ نے لا الٰہ الا اللہ فرمایا اور ساتھ ہی نبوت کا دعویٰ کیا۔ اغیار تو اغیار اعزّہ واقارب عقارب (۱) بن گئے۔ سب لوگ جان کے دشمن ہوگئے۔ ہر جگہ دو دو مذہب ہوگئے۔ تو کیا کوئی متنفس یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے نا تفاقی کی بلکہ آپ تو عین اتفاق کے واسطے تشریف لائے ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اتفاق ہی کی جانب اُن کو مدعو کیا۔ تو حاصل یہ ہے کہ جو باطل پر ہو اُس کو حق والے کے ساتھ متفق کرو اور بالعکس معاملہ سے تحرز کرو (۲)۔

رسول اللہ ﷺ کو کفار کی پیش کش

جناب رسالتمآب ﷺ نے نبوت کا دعویٰ کیا تو مکہ کے چند عمائد مجتمع ہوکر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ہم لوگ قوم کی جانب سے ایک وفد ہیں اور جناب والا کی خدمت میں ایک درخواست ہے۔ وہ یہ کہ آپ خطۂ حجاز میں شورش (۳) نہ پھیلاویں اور جو مقصود ہو اس کو بیان فرمادیں۔ ہم آپ کے مطلب کو پورا کردیں گے۔ اگر جناب مال ودولت کے متمنی ہوں، تو ہم ایک بڑا خزانہ جمع کردیں۔ اپنے سب اموال سے دست بردار ہوجاویں اور آپ کے سپرد کردیں۔ اپنے اوپر قیاس کیا۔ جیسے خود مال کے حریص ولالچی تھے اسی طرح خساست نفس (۴) سے حضور ﷺ کو بھی تصوّر کیا۔ بھلا حضور ﷺ کے سامنے مال کی

---

(۱) بچھو (۲) اس کے خلاف برتاؤ سے بچو (۳) حجاز کی سرزمین پر فساد نہ پھیلائیں (۴) اپنے نفس کی برائی کے سبب۔

کیا پرواتھی۔ آپ ﷺ سے تو کوہ التجا(۱) کرتے تھے کہ ہم سونے کے ہوجائیں اور آپ ہمیشہ انکار فرماتے تھے۔ آپ ﷺ تو سلطان دوجہاں تھے۔

خیر پھر عمائد نے کہا، اور آپ ﷺ کو عورتوں کی حاجت ہو تو قریش کی سب کنواری لڑکیاں حاضر کردی جائیں۔ جتنی آپ ﷺ چاہیں پسند فرمالیں۔ چونکہ حضور سرور کائنات ﷺ بہت عالی نسب تھے اس لئے ان کو اپنی لڑکیاں دینا عار نہ تھا بلکہ اور باعثِ فخر تھا۔ یا آپ ﷺ ہم پر حکومت کرنا چاہتے ہوں تو ہم آپ کو اپنا بادشاہ بنالیں۔ لیکن خدارا ان باتوں سے دست بردار ہوجایئے۔

حضور ﷺ کا جواب اور کفار کی حیرانی

آپ ﷺ نے ان سب باتوں کے جواب میں فرمایا مجھ کو کسی شئے کی حاجت نہیں۔ میں کچھ نہیں چاہتا بجز اعلاء کلمۃ اللہ کے فقط ایک ہلکی سی بات کہہ لو کہ لا الٰہ الا اللہ۔ اس پر مشرکین نے کہنا شروع کیا۔

﴿اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ﴾ ''کیا اس نے اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا واقعی یہ بہت ہی عجیب بات ہے''

اور یہی کہا:

﴿مَاسَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ﴾ ''ہم نے تو یہ بات پہلے مذہب میں نہیں سنی''

اور یہ بھی کہا:

﴿ءَاُنْزِلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَیْنِنَا﴾ ''کیا ہم سب میں سے اس شخص پر احکامِ الٰہی نازل کیا گیا''۔

یعنی آپ ﷺ تو مالدار ہیں نہ حاکم ہیں نہ پڑھے لکھے ہیں۔ آپ ﷺ پر

(۱) آپ سے تو پہاڑ تک یہ کہتے تھے کہ اگر آپ چاہیں ہم سونے کے ہوجائیں اور آپ کے ساتھ چلیں۔

وحی کیسے نازل ہوئی۔ اس کے مستحق تو ہم تھے۔ ہم پر کیوں نازل نہیں ہوئی۔

اتفاق مطلقا مطلوب نہیں

تو یہ یہ مخالفتیں پیش آئیں اور پھر بھی حضور ﷺ کا اتفاق کے واسطے تشریف لانا مسلم ہے تو معلوم ہوا مطلق اتفاق محمود نہیں۔ میں پوچھتا ہوں تم نے اتفاق سیکھا کس سے صرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کیونکہ کسی غیر کا اتفاق تو معتبر نہیں۔ تو بس حضور ﷺ کا عملی اتفاق دیکھ لو اور اُسی کے موافق تم بھی عمل کرو۔

حضور ﷺ کی ثابت قدمی

تمام فرق باطنہ، دہریہ، ملحدین، صائبین، گبر، مجوس، یہود، نصاریٰ، مشرکین آپ سے علیحدہ ہوگئے تھے۔ سب مخالفت پر کمر بستہ تھے۔ اگر حضور ﷺ استقلال سے کام نہ لیتے تو بہت سخت مشکل کا سامنا تھا۔ ہزاروں لوگ قتل کے درپے تھے۔ ایک یکہ وتنہا ذات (۱) پر اتنا ہجوم! خدا کی پناہ۔ نہ اتنی قوت تھی نہ مال تھا نہ اس قدر صحابہ اور رفقاء تھے۔ ادھر ارشاد تھا۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ط وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ط ﴾ ''اے رسول ﷺ! جو کچھ آپ ﷺ کے رب کی جانب سے آپ پر نازل کیا گیا آپ سب پہنچا دیجئے۔ اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو آپ نے اللہ تعالیٰ کا ایک پیغام بھی نہیں پہنایا۔ اللہ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔

آپ اس وحی کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم میں تشریف لائے۔ اُس زمانہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم جناب کی حفاظت کیا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا، جاؤ اب کسی کی

(۱) صرف آپ کی ایک اکیلی ذات اقدس اس قدر چڑھائی۔

حاجت نہیں۔ اب حافظ حقیقی میرا نگہبان ہے۔ میں تنہا کام کروں گا۔ ایک بے سامان شخص کے واسطے ایسی اولوالعزمی بہت مشکل کام ہے۔ پھر دیکھئے قدرتِ حق کا نمونہ کہ سب لوگ آپ ﷺ کے ساتھ ہوئے اور سب متفق ہوکر بودوباش کرنے لگے۔

پسندیدہ اتفاق

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اتفاق مطلق مطلوب نہیں۔ ورنہ ایسا اتفاق تو حضور ﷺ کو قبل از دعویٰ نبوت حاصل ہی تھا بلکہ اتفاق وہی معتبر ہے جس میں اہل باطل کو اہل حق کے ساتھ متفق کیا جائے۔ جیسے کہ اس مقصود میں حضور ﷺ کو بعد از تبلیغ کامیابی ہوئی۔ اسی واسطے آیت میں اِجْتَمَعُوْا کا لفظ نہیں فرمایا بلکہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ فرمایا۔ جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ مطلق اجتماع مراد نہیں بلکہ وہ اجتماع جس میں دین اللہ ہو وہ مطلوب ہے۔ اور دین اللہ ہی مطلوب وغیر مطلوب کا معیار ہے۔ جس اجتماع میں دین اللہ فوت ہوتا ہو اُس کو دور ہی سے سلام کرنا چاہئے۔ اگرچہ ساری قوم کے خلاف وضع اختیار کرنی پڑے مگر دین اللہ سے ہرگز منہ نہ موڑے۔

حق پر قائم رہنے کی ضرورت

میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو شخص حق پر ہو اُس کو اتفاق کی کوشش کی ضرورت نہیں بلکہ بس حق پر قائم رہنے کی ضرورت ہے۔ دیکھو مقناطیس کی جذب حدید(۱) میں کسی عملی تدبیر کی ضرورت نہیں بلکہ قدرۃً اُس میں کشش آہن کا مادہ موجود ہے(۲) اسی طرح حق میں فطری تاثیر ہے کہ باطل کو اپنی جانب جذب کر لیتا

(۱) مقناطیس کو لوہے کو کھینچنے میں کسی تدبیر کی ضرورت نہیں (۲) قدرتی طور پر اس میں لوہے کو اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت ہے۔

ہے کسی سعی وتدبیر کی حاجت نہیں بجز قیام علی الحق(۱) کے۔ اس سے باطل یا تو منعدم(۲) ہوجائے گا یا حق میں منجذب ہوجائے گا۔

اصلاح کا طریقہ

ایک مرتبہ تھانہ بھون میں میرے ایک عزیز نے ترک رسوم کے بارے میں ایک مجمع کیا اور کہا صاحب مصلحت شرعی وعرفی کا مقتضا یہ ہے کہ ان رسومات جہل کو اٹھادینا چاہئے اور آپس میں معاہدہ کرلینا چاہئے کہ آئندہ نہ رسومات خود کریں گے نہ اور جگہ شریک ہوں گے۔ ایک صاحب نے اس وعظ ونصیحت کے بعد اٹھ کر یہ کہہ دیا، جی کیا ہمارے بزرگ بیوقوف تھے جو یہ رسومات کرتے تھے اُن کو اتنی عقل نہ تھی۔ بس سب پر پانی پھیر دیا اور سب مجمع منتشر ہوگیا۔ میں بھی اس مجمع میں تھا۔ میں نے کہا، اس طرح تو کامیابی مشکل معلوم ہوتی ہے ایک عملی اور شرعی تدبیر کرو۔ چنانچہ ایک تو میں نے رسوم کے بارے میں اصلاح الرسوم ایک کتاب لکھی۔ دوسرے یہ کیا کہ کسی کو کچھ مت کہو عمل شروع کردو سب درست ہوجاویں گے۔ ہم نے اپنے گھر میں عمل شروع کیا۔ رفتہ رفتہ سب قصبہ نے عمل شروع کردیا اور بفضلہٖ اس بلا سے تمام قصبہ مامون ہے اور اگر کہیں ہے بھی تو شاذ ونادر۔ بلکہ خود رسوم کے کرنے والے بھی متاثر ہوتے ہیں اور کہتے ہیں نامعلوم وہ پہلی سی رونق کہاں گئی۔

﴿قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾(۳) ''آپ کہہ دیجئے کہ حق آیا اور باطل گیا گزرا ہوا۔ واقعی باطل چیز تو یوں ہی آتی جاتی رہتی ہے''۔

(۱) کسی کوشش اور تدبیر کی ضرورت نہیں سوائے حق پر عمل پیرا ہونے کے (۲) باطل مٹ جائے گا (۳) سورہ بنی اسرائیل:۸۱۔

اگر تم کسی کو راہ پر لانا چاہتے ہو تو اپنی اصلاح کرلو وہ خود بخود ٹھیک ہوجائے گا۔ اس کی پروانہ کرو۔ اور اگر ہم اپنی اصلاح نہ کریں گے تو لوگ طعن تشنیع کریں گے۔ اور کہیں گے بڑے بزرگ بنے، بڑے مولوی صاحب ہیں بلکہ ﴿لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ﴾ ''وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا اندیشہ نہیں کریں گے'' مدنظر رکھنا چاہئے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذریعہ سے جو اسلام پھیلا وہ ان کی اصلاح نفوس (۱) کی وجہ سے پھیلا۔ یہ جو لوگ مشہور کرتے ہیں کہ اسلام شمشیر کے ذریعہ سے پھیلا بالکل غلط ہے۔ شمشیر کا اسلام قلب میں نہیں اُترتا۔ وہ تو لسان ہی پر مقصور رہتا ہے (۲) یہ بات کہ صمیم قلب (۳) میں گھس جائے ادیان باطلہ (۴) سے نفرت ہو جائے صرف اصلاحِ باطن ہی سے ہوتی ہے۔

اسلام اور تلوار

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں فارس کا ہرمزان شہزادہ گرفتار ہوکر آیا۔ اسلام کے قاعدہ کے موافق اُس پر اسلام کو پیش کیا گیا۔ اس نے قبول کرنے سے انکار کیا اور مطیع ہوکر رہنے سے بھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قتل کا حکم دیا۔ اُس نے درخواست کی کہ مجھ کو تھوڑا سا پانی پلا دیجئے۔ تو چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے۔ ﴿اِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ﴾ ''جب تم قتل کرو تو اچھی طرح کیا کرو''۔ کہ آسانی اور سہولت سے قتل کیا کرو۔ اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پانی پینے کی اجازت دی۔ اُس نے گلاس منہ سے لگا کر علیحدہ کرلیا اور کانپنے لگا۔ سبب

(۱) اپنی اصلاح کرنے کی بنا پر (۲) صرف زبان تک محدود رہتا ہے (۳) دل کی گہرائی میں اتر جائے (۴) باطل دینوں سے نفرت ہو۔

پوچھا کہا کہ مجھ کو اندیشہ ہے کہیں پانی پیتے ہوئے میری گردن پر تلوار نہ چلے۔ آپ نے فرمایا، نہیں ایسا نہ ہوگا۔ اُس نے کہا، اچھا وعدہ کر لیجئے کہ جب تک میں یہ پانینہ پیوں قتل نہ ہوں۔ آپ نے سادگی سے وعدہ کر لیا۔ آپ کو اس کی کید مضمر (۱) کی کچھ خبر نہ تھی۔ اُس نے عہد لیتے ہی پانی زمین پر پھینک دیا کہ نہ قیامت تک یہ پانی ہوگا نہ میں پیوں گا۔ اور نہ قتل ہوں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت حیران ہوئے اور فرمایا کہ جاؤ بے فکر رہو ہم وعدہ خلافی نہیں کریں گے۔ اس نے فوراً ہی خلوص دل سے کہا۔

﴿اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدً رَسُوْلُ اللّٰه﴾

اور یہ کہا کہ میں نے یہ حرکت اس وجہ سے کی تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ میں نے شمشیر کے خوف سے اسلام قبول نہیں کیا اور نہ مجھ پر اسلام کے قبول کرنے میں کچھ دباؤ ہوا۔ ورنہ مسلمان تو میں پہلے ہی ہو چکا تھا۔ کفار نے بھی سمجھ لیا تھا کہ یہ شمشیر سے کام نہیں لیتے کیونکہ جنگ سے دوسروں کے اخلاق پر کیسے اثر ہوسکتا ہے۔ یہ لوگ اخلاق ہی سے اسلام پھیلاتے ہیں۔

اسلام کا عدل وانصاف

ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں آپ کی ایک زرہ گم ہوگئی۔ آپ نے اس کو ایک یہودی کے پاس دیکھا جو ہر اعتبار سے ذلیل تھا۔ آپ نے اُس سے فرمایا کہ زرہ میری ہے۔ اُس نے کہا ہماری ہے اور دینے سے انکار کر دیا۔ دیکھئے آزادی قابل غور ہے۔ جانتا تھا کہ یہ لوگ عادل (۲) ہیں بغیر حجت کے کبھی دار وگیر نہ کرینگے (۳) اسی وجہ سے اس قدر گستاخی سے پیش آیا اور کہا جایئے نالش (۴) کیجئے۔ حضرت شریح تابعی قاضی تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ماتحت

(۱) پوشیدہ چال (۲) عدل وانصاف کرنے والے (۳) بغیر دلیل کبھی نہیں پکڑیں گے (۴) مقدمہ۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے دارالقضاء میں گئے۔ دیکھئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تواضع کہ خود باوجود خلیفۃ المسلمین ہونے کے دارالقضاء میں تشریف لے گئے۔ یہ نہیں کیا کہ قاضی صاحب کو بلوالیتے۔ باقاعدہ دعویٰ کیا۔ حضرت شریح نے بمقتضائے البنیۃ علی المدعی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے گواہ طلب کئے۔ دیکھئے اسلام کی آزادی، اسلام کا عدل وانصاف کہ خود ملازم نے بادشاہ سے اس طور پر ثبوت مانگا جیسا کہ ایک ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی سے مانگا جاتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک تو حضرت حسن کو پیش کیا۔ دوسرا آپ کا آزاد کردہ ایک غلام تھا۔ حضرت شریح نے فرمایا کہ غلام کی شہادت تو مقبول ہے کیونکہ آزاد کردہ ہے البتہ آپ کے لئے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی شہادت حجت (۱) نہیں ہے لہذا دعویٰ خارج کیا گیا (یہ مسئلہ اجتہادی ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ بیٹے کی شہادت باپ کے لئے حجت مانتے تھے اسی لئے اُن کو پیش کیا۔ حضرت شریح نہ مانتے تھے اس لئے قبول نہیں کیا۔

یہودی کا قبول اسلام

حضرت علی رضی اللہ عنہ ہنسی خوشی دارالقضاء سے باہر تشریف لے آئے۔ یہودی بھی آپ کے پاس آیا اور کہا: ﴿اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدً رَسُوْلُ اللّٰـــه﴾ ’’کہا مجھ کو مذہب اسلام کی حقانیت ثابت ہوگئی کہ آپ نے اپنی زرہ پہچانی آپ نے مجھ سے زبردستی نہ لی۔ قاضی نے ڈگری مجھے دی اور آپ چیں بجبیں نہ ہوئے (۲)۔ اس کے بعد زرہ واپس کردی اور خدام میں داخل ہوگیا۔

اس طرزِ عمل سے لوگ مسلمان ہوئے ہیں۔ اس واقعہ میں انہوں نے کون سی شمشیر زنی کی تھی۔

(۱) قبول نہیں (۲) اس پر آپ نے کسی ناگواری کا اظہار بھی نہیں کیا۔

آج کل مسلمانوں کا حال اور اس کا نتیجہ

دیکھئے ایک زمانہ تو وہ تھا کہ کفار مسلمانوں کو دیکھ کر اسلام کی طرف رغبت کرتے تھے۔ ایک آج کل کا زمانہ ہے کہ ہم کو دیکھ کر مسلمین بھی نفرت کرتے ہیں۔

چنانچہ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں کسی نے ایک مجوسی سے کہا کہ تو مسلمان ہوجا۔ اُس نے جواب میں کہا کہ اگر بایزید جیسا مسلمان ہونا مراد ہے تو یہ مجھے مشکل ہے اور اگر تم جیسا ہونا مراد ہے تو تم سے تو میں ہی اچھا ہوں۔ خیر یہ تو اس کی حماقت تھی کہ مجوسیت کو اسلام پر ترجیح دیتا تھا۔ خواہ وہ کسی درجہ کا اسلام ہو لیکن مقصود اس حکایت سے یہ ہے کہ بعض لوگوں کے اسلام کو کفار بھی پسند نہیں کرتے۔

اسلام کمزور نہیں اہل اسلام کمزور ہیں

حاصل یہ ہے کہ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا۔ دیکھو ہم لوگوں میں گو وہ بات نہیں ہے اور اسلام کے ویسے محاسن ہم میں نہیں تاہم ہمیں کو دیکھ دیکھ کر سینکڑوں مسلمان ہوتے ہیں تو اب ان کی گردن پر کون تلوار رکھتا ہے۔ یہ صرف اسلام کی حقانیت ہے البتہ آج کل اہل اسلام ضرور ضعیف ہیں۔ باقی اسلام میں وہی قوت ہے وہی کشش ہے۔ یہ اُسی کا اثر ہے جن لوگوں نے ابتداء اسلام میں اسلام قبول کیا تھا ان میں کیا کیا آفتیں نہ آئیں، تلواریں چلیں، خاندان چھوٹے مال و دولت ہاتھ سے گئے لیکن سب کو گوارا کیا۔ ان پر کون سی تلوار چلی تھی۔ البتہ جن لوگوں نے جان کر شرارت سے اس میں مزاحمت کی ان کے لئے یہ قانون مقرر کرنا ضرور تھا کہ اسلام ہو یا استسلام (۱) ہو کہ باج گزار، خراج گزار ہوکر رہو، حلقہ اطاعت وانقیاد اپنے گوش میں آویزاں کرو یا مسلمان ہوکر لذتِ دارین حاصل کرو ورنہ تلوار

(۱) اسلام قبول کریں یا جزیہ دے کر رہتے رہیں۔

کے گھاٹ اُترو۔ دیکھئے سب سے پہلے اسلام کی ایک جڑ تھی یعنی فخر عالم ﷺ کی ذات بابرکات۔ تو کیا وہ ایک ذات تلوار سے سب کا مقابلہ کرسکتی تھی۔ اصل سبب اُس ذات کی برکت تھی جس نے تمام عرب وعجم، فارس و روم، یورپ وہند میں اسلام کے پرچم اڑائے جس کے نشانات اب تک ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں ۔

ہنوز آں ابر رحمت در فشانست خم و خمخانہ بامہر ونشانست

''ابھی وہ ابر رحمت موتی بکھیر رہا ہے۔ خم اور خم خانہ بارونق ہے''

اب تک وہی آب وتاب ہے۔ اس لئے میں یہ کہا کرتا ہوں کہ اسلام ضعیف نہیں بلکہ اہل اسلام ضعیف ہیں۔ اسلام کے اندر جو کسی کو ضعف معلوم ہوتا ہے وہ فی الحقیقت اپنا ضعف ہے(۱)۔

ہمارے قصبہ میں ایک گنوار عورت اپنے بچہ کو پاخانہ کرا کر چاند دیکھنے کو اٹھی اتفاق سے ناخن میں کچھ پاخانہ لگا رہ گیا تھا۔ انگلی کو ناک پر رکھا جیسا کہ عورتوں کی عادت ہوتی ہے۔ تو ناخن میں سے پاخانہ کی بو آئی کہنے لگی اوئی اب کے کیسا سڑا چاند نکلا ہے۔

سو ایسے ہی ضعف اپنے اندر ہیں مگر اسلام کے سر چپکتے ہیں۔

حقانیت اسلام

اسلام کی حقیقت تو عقائد اور دیانات، معاملات، معاشرت اعمال ہے، سو ان احکام میں کیا ضعف آ گیا۔ اس میں ضعف غلط مبحث سے ہوتا ہے۔ سو اسلام اس سے بالکل محفوظ ہے۔ حق وباطل تمام ترممیّز ہے۔ اسلام آئینہ کی طرح صاف ہے۔ اس میں میل کا نام نہیں۔ دیکھئے جتنی کتابیں ہیں سب میں تحریف ہے لیکن

(۱) اپنی کمزوری۔

قرآن پاک ہے کہ اس میں ایک نقطہ کا بھی ردّ وبدل نہیں اور نہ ہوگا اِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ ارشاد ہے۔ اور دیکھو کہ قرآن پاک کے لاکھوں کروڑوں حافظ ہیں۔ اگر ایک بڑے سے بڑا مولوی غلطی کرے ایک بچہ روک سکتا ہے۔ یہ کیفیت ہے کتاب اللہ کی۔ اور ہر دین کی خدمت کتابوں اور ان کتابوں کے حاملین سے ہوتی ہے۔ سو اسلام کی تمام تعلیمیں مدون ہیں (۱) اور اہل حق ہمیشہ رہیں گے۔

قوت اسلام کی دلیل

چنانچہ حضور ﷺ کا وعدہ ہے۔ (لَا یَزَالُ طَائِفَۃٌ مِنْ اُمَّتِیْ مَنْصُوْرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ لَا یَضُرُّھُمْ مِنْ خَذَلَھُمْ) (۲)۔

اب اس کے بعد بتاؤ کہ اسلام میں ضعف کہا ہے۔ البتہ اہل اسلام میں بے شک ضعف ہے جس کی مثال بعینہ یہ ہے کہ کھانا اچھا عمدہ موجود ہے لیکن کھانے والا بیمار ہے کہ برا معلوم ہوتا ہے یا کھانے والے کو صفرا (۳) ہوا ہے کہ کڑوا معلوم ہوتا ہے۔ تو اب خرابی کھانے میں ہے یا کھانے والے میں ہے؟ اسی طرح مسلمان ضعیف ہے یا اسلام ضعیف ہے ؎

ہنوز آں ابر رحمت در فشانست خم و خم خانہ بامہر و نشانست

''ابھی وہ ابرِ رحمت موتی بکھیر رہا ہے۔ خم وخمخانہ بارونق ہے''

یہ تو قوتِ اسلام کی لمّی دلیل تھی اور اسلام کے مضبوط ہونے کی دلیل انّی یہ ہے کہ جو شخص اس کو اختیار کرے وہ کمزور نہیں رہتا۔ تو اگر دین میں یہ اثر نہیں تو یہ قوت کہاں سے آئی۔ اگر لاٹھی مضبوط نہ ہو تو انسان بے خوف نہیں چل

(۱) کتابوں میں محفوظ ہیں (۲) میری امت میں ایک جماعت دین حق پر ہمیشہ قائم رہے گی لوگوں کی مخالفت انہیں کچھ نقصان نہ پہنچا سکے گی (۳) اس کے منہ کا ذائقہ خراب ہے۔

سکتا۔ اور اگر لاٹھی مضبوط ہو تو انسان بے خوف و خطر چلا جاتا ہے اسلام میں اگر طاقت نہ ہو تو انسان خوف کرے لیکن اسلام کی طاقت تو روز بروز ترقی پر رہتی ہے۔ اس لئے معلم کامل کی حالت پیرانہ سالی میں یہ رہتی ہے ؎

خود قوی ترمے شود خمرِ کہن خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

''پرانی شراب تیز ہوجاتی ہے۔ خاص کر وہ شراب جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو''

اور فرماتے ہیں ؎

ہر چند پیر و خستہ وبس ناتواں شدم ہر گہ نظر بُردے تو کردم جواں شدم

''ہر چند بہت کمزور اور بوڑھا ہو چکا ہوں لیکن جس وقت تیرے چہرے پر نظر کرتا ہوں جوان ہوجاتا ہوں''

قوتِ ایمانی

میں نے دیکھا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ باوجود ضعف کے جب کچھ بیان فرماتے تھے تو بہت بلند آواز سے فرماتے تھے اور گھنٹوں بیان کیا کرتے تھے حالانکہ بعد میں آہ آہ کرنے لگتے تھے۔ میری موجودگی میں مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کی عمر سو سال سے زیادہ تھی۔ ایک مرتبہ فجر کے وقت خوب سردی کے زمانہ میں خادم سے کہا کہ غسل خانہ میں گھڑا رکھ دے، مجھے کچھ شبہ معلوم ہوتا ہے، پھر کھلے غسل خانہ میں کھڑے نہائے اور خود آکر امامت کی تو اس عمر میں اول تو شبہ ہی مستبعد ہے۔ دوسرے ایسے موقع میں نہانا پھر امامت کرنا سب باتیں طاقت کی علامتیں ہیں۔ گو یہ ضروری نہیں کہ جس میں قوت بھی ہو مگر روحی طاقت تو ضرور ہوتی ہے لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ روحی اثر جسمی طاقت کو بھی تادیر قائم رکھتا

ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے بزرگ باہمت ہوتے ہیں۔

اُن میں ضعف اور بوداپن نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق میں بڑی قوت ہے۔

چراغ خداوندی

بعض لوگ اسلام کی مثال بیوہ عورت سے دیتے ہیں کہ اس وقت اُس کا کوئی اعانت کرنے والا نہیں ہے بالکل غریب ومحتاج ہے ﴿لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ﴾ اسلام محتاج نہیں اور نہ کسی شخص کا اسلام کی خدمت سے اسلام پر احسان ہے ؎

منت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتنت

''اگر تم سلطان کی خدمت کرتے ہو تو تم کو احسان نہ رکھنا چاہئے بلکہ خود سلطان کا احسان ماننا چاہئے کہ تم کو خدمت میں رکھا''

اسلام کا احسان ہے کہ تم کو خادم بنایا۔ اسلام کسی ذات کے وجود وعدم پر موقوف نہیں (۱)۔ دیکھو حضور ﷺ سے زیادہ کون ہوگا۔ حضور ﷺ کے تشریف لے جانے سے اسلام کا نشان تک نہ رہتا۔ لیکن حضور ﷺ تشریف لے گئے اور برکات حضور ﷺ کی اب تک موجود ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ جب حضور ﷺ کی تشریف بری سے اسلام میں کچھ تذبذب نہ آیا تو اور کسی شخص کے معدوم (۲) ہوجانے سے اسلام پر کیا اثر پڑسکتا ہے اور جس کو زعم ہو وہ چھوڑ کر دیکھ لے۔

بعض لوگ چندہ دے کر احسان رکھا کرتے ہیں۔ وہ چندہ موقوف (۳) کر کے دیکھ لیں کہ خدا کا کام انجام پذیر ہوتا ہے یا نہیں۔ ہاں ہم اس کے ذمہ دار

(۱) اسلام کا بقاء کسی کے ہونے نہ ہونے پر موقوف نہیں (۲) نہ رہنے سے (۳) روک کر دیکھ لیں۔

نہیں کہ وہ کام اُسی جگہ انجام پذیر ہو۔ یہاں نہیں اور جگہ ہوگا مگر ہوگا ضرور۔ دیکھو گورنمنٹ کے محکمے ٹوٹ جاتے ہیں لیکن یہ نہیں ہوتا کہ بالکلیہ ہی معدوم ہوجاویں دوسری جگہ قائم ہوجاتے ہیں۔ مثلاً پولیس کا محکمہ کہ ایک گاؤں سے توڑ دیا جاتا ہے مگر دوسری پولیس سے اُس گاؤں کا انتظام متعلق ہوجاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ بستی کا مدرسہ تو ٹوٹ گیا۔ تو بھائی دوسری جگہ کے مدرسہ سے اس بستی کی تعلیم کا انتظام ہوگیا۔ انعدام (۱) نہیں ہوا، انتقال ہوا ہے (۲) جیسے سرکاری محکمہ جات منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح خداوندی محکمے بھی منتقل ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ دین کا چراغ بجھ نہیں سکتا۔ وہ ہمیشہ روشن رہتا ہے۔

اگر گیتی سراسر باد گیرد چراغ مقبلاں ہرگز نمیرد

''اگر ساری زمین میں آندھیاں آجاویں تو بھی اہل اللہ کا چراغ گل نہیں ہوسکتا''

تو چراغ تو نہیں بجھتا البتہ ایسا ہوتا ہے کہ باد مخالف کے جھونکے کی وجہ سے یا کسی کی ناقدری کی وجہ سے کہ اُس کے گل کرنے کی فکر میں لگ گئے اس طاق میں سے دوسرے طاق میں رکھ دیا جاتا ہے اور تبدیل طاق میں چراغ کی کوئی مصلحت نہیں۔ اُسی جگہ کے لوگوں کی مصلحت سے ایسا کیا گیا۔ یہ روشنی سے محروم نہ ہوں یا اس وجہ سے کہ مبادا یہ نادان اپنے ہاتھ پیر نہ جلالیں۔

ایک مرتبہ بچپن میں میں اور میرے ایک اور عزیز کہ وہ ابھی بچے تھے گھر میں شرارت کرنے لگے۔ اور چراغ کو پھونک مار کر گل کرنے لگے۔ گھر والوں نے اس کو ایسی جگہ رکھ دیا کہ پھونک نہ پہنچ سکے۔ ہم نے ٹوپی اچھالنا شروع کردی انہوں نے اور اونچا رکھ دیا۔

(۱) بالکلیہ ختم نہیں ہوا (۲) ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوا ہے۔

تو مقصود یہ ہے کہ بے قدری کرنے کی بدولت ان سرکشی کرنے والوں سے چراغ دور ہوجاتا ہے بجھتا نہیں۔ بعض بزرگوں کی کرامت منقول ہے کہ آندھی سے اُن کا چراغ نہیں بجھتا تھا۔ تو اللہ میاں کے چراغ کو کون بجھا سکتا ہے ۔

چراغے را کہ ایزد بر فروزد ہر آنکس تف زندریشش بسوزد

''جس چراغ کو اللہ تعالیٰ نے روشن کیا ہو اس کو گل کرنے کے لئے جو پھونک مارے گا اس کی داڑھی جل جائے گی''

بے وقوف کی حکایت

اس ''ریشش بسوزد'' پر مجھ کو لطیفہ کے طور پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک احمق نے کسی کتاب میں دیکھا کہ جس شخص کی داڑھی لمبی اور سر چھوٹا ہو، وہ بے وقوف ہوتا ہے۔ آپ کو شبہ ہوا۔ آئینہ میں چہرہ مبارک ملاحظہ فرمایا۔ اپنی صورت پر حماقت کی علامت کو منطبق پایا۔ آپ کو درستی کی فکر ہوئی۔ قینچی وغیرہ تلاش کی کچھ نہ ملا۔ مجبور ہوکر داڑھی کو چراغ کے سامنے کردیا کیونکہ سر کو بڑا کرنہیں سکتے تھے۔ داڑھی کو چھوٹا کرنے لگے۔ جتنی داڑھی باقی رکھنا تھی اس کو مٹھی میں لے لیا۔ باقی کو جلانے کے واسطے چراغ پر رکھنا تھا کہ آگ کی لپیٹ سے ہاتھ علیحدہ ہوگیا اور داڑھی کا صفایا ہوگیا۔

احمق تھا نا علامت کو علت سمجھا کہ رفع مستلزم ہے رفع معلول کہ (۱) دوسری بے عقلی یہ کی کہ اس قدر عجلت (۲) سے کام لیا۔ خیر بعد میں مقر ہوئے کہ واقعی کتاب میں سچ لکھا ہے ۔ میں ضرور احمق ہوں۔ ہاں اس داڑھی کے جلنے کا اتنا اثر تو ضروری ہوا کہ اتنی سمجھ فورا آگئی کہ میں احمق ہوں۔ علامت کے دفع ہوتے ہی

(۱) جب علت ختم ہوجائیگی معلول بھی باقی نہ رہے گا یعنی داڑھی چھوٹی سر بڑا ہوجائے گا تو میں بے وقوف نہ رہوں گا (۲) جلد بازی۔

حماقت معلوم ہوگئی۔ اسی طرح چراغ خداوندی کو بجھانے والے کی ریش جل جاتی ہے۔

تو مقصود یہ ہے کہ اللہ میاں بندوں کی مصلحت کی وجہ سے مقام تبدیل فرماتے ہیں۔ اسی راز کو سمجھ کر محقق مشائخ کسی خلیفہ کو سجادہ نشین نہیں بناتے بلکہ جو شخص کسی جگہ ہو اس مقام کو حاصل کرلے وہی سجادہ نشین ہے اور اس سجادہ پر بیٹھنے سے صاحب مقام تھوڑا ہی بنتا ہے۔ وہ تو مقام باطن ہے خواہ ہرات میں ہو خواہ کوفہ بصرہ میں۔

بزرگوں کی نشست

ایک خوب لطیفہ یاد آیا۔ ایک صاحبِ علم کو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے پاس بیٹھنے کو فرمایا۔ وہ تواضع کرنے لگے کہنے لگے ؎

دلاتا بزرگی نیاری بدست بجائے بزرگاں نباید نشست(۱)

فرمایا جائے بزرگاں سے مراد یہ حسی جگہ نہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ان سے مساوات کا دعویٰ نہ کرے۔ اور جگہ کیا رکھا ہے۔ اور اگر جائے بزرگاں سے یہی مقام مراد ہے تو پھر اس میں تفصیل ہے۔ کسی ظریف نے تو بلا تفصیل اس کی جگہ یہ کہا ہے ؎

بجائے بزرگاں بیاید نشست کہ شاید بزرگی بیاید بدست(۲)

خیر یہ تو شاعری ہے مگر اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر بزرگ کہیں تو بیٹھ جائے ورنہ نہ بیٹھے کیونکہ بے ادبی ہے۔ جب کہ وہ جگہ انہی کے ساتھ مخصوص ہو جیسے تکیہ مسند ورنہ بغیر کہے بھی کچھ حرج نہیں۔

(۱) جب تک بزرگی دل میں گھر نہ کر جائے بزرگوں کی جگہ مت بیٹھو (۲) بزرگوں کی جگہ ہی بیٹھ جاؤ شاید اسی طرح بزرگی ہاتھ آجائے۔

حکم کا مرتبہ ادب سے بڑا ہے

مولانا رفیع الدین صاحب دیوبند میں چارپائی پر پائنتی کی جانب بیٹھے تھے۔ میں حاضر ہوا تو سرہانے بٹھانے لگے۔ میں نے عذر کیا تو مولانا نے فرمایا کہ کہنے کے بعد انکار نہیں کرنا چاہئے اور اس کی تائید میں یہ حکایت بیان فرمائی (یا شاید میں نے کسی اور سے سنی ہے کچھ شک ہوگیا ہے) کہ دارالشکوہ اور عالمگیر میں اختلاف تھا اور ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ تخت وتاج میرے قبضہ میں ہو اور اس کی مختلف تدابیر میں مصروف رہتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ دارالشکوہ کو ایک صاحب حال درویش کا پتہ لگا۔ اس کی خدمت میں جا کر مؤدب کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنی جگہ چھوڑ کر وہاں بیٹھنے کو کہا۔ دارالشکوہ نے ادب کے سبب عذر کردیا۔ کیونکہ یہ درویشوں کے بے حد معتقد تھے خیر وہ اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ پھر دارالشکوہ نے تخت کے واسطے کہا۔ درویش صاحب نے فرمایا، میں تو تخت پر بٹھلاتا تھا مگر تو نے انکار ہی کردیا۔ بہت افسوس ہوا اور اس نے کسی سے نہیں کہا۔ کہیں عالمگیر کو خبر نہ ہوجائے۔

پھر ان صاحب حال کا عالمگیر کو پتہ چلا۔ دارالشکوہ تو جاہل تھے اور عالمگیر عالم تھے۔ گو دارالشکوہ کتابی علم رکھتا تھا۔ مگر اس کی حقیقت صرف زبان دانی ہے۔ زبان دانی دوسری شے ہے اور علم دوسری چیز زبان دان تو سب سے زیادہ عرب میں ابوجہل تھا (ابن جہل بھی نہیں) غرض جب عالمگیر ان کے پاس پہنچے تو وہ تعظیم کو کھڑے ہوگئے۔ اور اپنی جگہ چھوڑ کر وہاں اُن سے بھی بیٹھنے کو کہا۔ یہ بے تکلف جا کر بیٹھ گئے اور کہا کہ تخت وتاج دلوایئے فرمایا تخت پر تو تم بیٹھے ہی ہو اور تاج میرے قبضہ میں نہیں ہے پوچھا وہ کس کے متعلق ہے۔ کہا وہ تمہارے فلاں خدمت گار کے قبضہ میں ہے وہ اگر تمہارے سر پر ٹوپی یا عمامہ رکھ دے تو بس تاج مل گیا۔

دیکھئے ایک خدمت گار کو تاج بخشی کی طاقت حاصل تھی ۔

مبیں حقیر گدایانِ عشق را کیں قوم شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند
گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں کہ ناز بر فلک و حکم برستارہ کنم
خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر توچہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد(۱)

انہوں نے اس خدمتگار کا نام وغیرہ پورا پتہ بتادیا۔ پھر مکان پر واپس آکر اس خدمت گار کو بلایا۔ اسی آن بان سے اور اسی صولت وشکوت سے وہ آیا۔ کہا وضو کے واسطے پانی لاؤ۔ زبردستی وضو کرنا شروع کردیا۔ نہ وقت تھا نہ ضرورت تھی۔ عمامہ اتار کر علیحدہ کردیا۔ پھر تولیہ منگایا۔ اس کے بعد کہا ہمارے سر پر یہ عمامہ رکھ دو۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا، میری کیا مجال عمامہ کو ہاتھ لگاؤں۔ اس نے ڈانٹ بتلائی کہ نہیں جو ہم حکم دیتے ہیں کرنا پڑے گا جناب زبردستی اُس سے تاج لے لیا۔ وہ بیچارہ عمامہ رکھ کر اس فقیر کو کوستا رہ گیا کہ خدا اُس فقیر کا ناس کرے جس نے مجھے رسوا کیا۔
یہ مضمون استطراداً اس شعر کی تفسیر پر آگیا تھا

بجائے بزرگاں نباید نشست

سجادہ نشینی

اصل مضمون یہ تھا کہ جو شخص خدمتِ دین میں خلیفہ ہوتا ہے وہ حقیقی مقام نشین ہوتا ہے اس کو گدی سے بلکہ گدھے سے تعلق نہیں ہوتا۔ آج کل تو سجادہ نشینی کی محض رسم رہ گئی ہے۔ بزرگی وغیرہ سب رخصت ہوگئی ۔ نقطہ دکانداری باقی ہے۔

(۱) گدڑی پوش فقیروں کو اے لوگو حقیر نہ سمجھو۔ یہ بغیر پگڑ دستار کے بادشاہ ہیں، ظاہراً گو میکدہ کے فقیر ہیں لیکن جب ان پر حال غالب ہوتو آسمانوں پر ناز اور ستاروں پر حکم کرتے ہیں۔ زمانے کے فقیروں کو حقارت کی نظر سے مت دیکھو تم کو کیا پتہ ان میں کیسے کیسے شہسوار ہیں (۲) ضمناً۔

بعض نابالغ بچے بھی سجادہ نشین کئے جاتے ہیں اور سب سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ مریدین (دس تار) دستار باندھ کر سجادہ نشین بناتے ہیں حالانکہ وہاں ایک تار بھی نہیں ہوتا مگر ہے یہ اچھی بزرگی کہ مریدین سے حاصل ہوتی ہے۔

ضرورتِ توکل

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے دین کو کسی خادم کی ضرورت نہیں۔ جس خادم کو شرف حاصل کرنا ہو وہ اپنی غرض سے اس کی خدمت کرے۔ اب رہی ظاہری اعانت اور اس کا دخل اُس کے بقاء میں، تو اس کا امتحان کرلو اور دنیا بند کرکے دیکھو۔ معلوم ہوجائے گا کہ کسی پر تو دارومدار نہیں ہے تو اہل مدرسہ کو بھی چاہئے کہ استغناء سے کام لیں۔

(اَجْمِلُوْ فِی الطَّلَبِ وَتَوَکَّلُوْا عَلَیْہِ) بڑے پیمانہ پر کام نہ سہی، مختصر ہی تجویز کرلو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مدرسہ وطلبہ اہل دنیا کی نظروں میں حقیر نہ ہوں گے۔ جیسے آج کل حقارت کا مرض وباء عام کی طرح پھیل رہا ہے۔

ایک تحصیلدار صاحب کے یہاں ایک طالب علم مدرسہ کا کھانا لینے جایا کرتے۔ اور انتظار میں بہت بیٹھنا پڑتا۔ ایک دفعہ انہوں نے تحصیلدار صاحب سے کہا کہ آپ کا لڑکا بہت کھیلا کرتا ہے۔ کہئے تو میں یہاں بیٹھنے کے وقت اس کو کچھ عربی پڑھادیا کروں۔ فرمایا، مولانا عربی پڑھنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ آپ نے عربی پڑھی تو میرے دروازہ پر روٹی مانگنے آئے۔ یہ عربی پڑھے گا تو آپ کے دروازہ پر مانگنے جائے گا۔

دیکھئے یہ نتیجہ ہوتا ہے امراء کے دروازہ پر جانے کا۔ دین کی عظمت کا مقتضاء تو یہ تھا کہ اس کے بعد سے وہاں نہ جاتے اور انکار کردیتے اور خدا پر توکل

کر کے بیٹھ رہتے ۔

ہیں توکل کن ملرزاں پاؤ دست رزقِ تو بر تو عاشق تراست

کسی حکیم نے کہا ہے ۔

بے مگس ہر گز نماند عنکبوت رزق راروزی رساں پر می دہد

کہ رزق کے پر لگا دیئے جاتے اور بغیر طلب کے ملتا ہے

حیف باشد دلِ دانا کہ مشوش باشد

اہل مدارس کو نصیحت

افسوس ایک دونان کے واسطے دونان کی طرح ذلت اٹھائی جائے

بئس المطاعم حین الذل تکسبھا فالقدر منتصب والقدر مغفوض

قدر کے معنی ہانڈی کے ہیں اور قدر آبرو کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے مطاعم سے ہانڈی تو بلند ہوتی ہے لیکن آبرو گھٹ جاتی ہے۔ تو چندہ کے لئے کسی کے درپے مت ہو۔ خطاب خصوصیت سے بالکل دست بردار ہوجاؤ۔ ضروریات مدرسہ کا صرف اعلانِ عام کردو چلنا پھرنا چھوڑو۔ ایک جگہ آرام سے بیٹھ رہو۔ بس اگر چندہ زیادہ ہو کام زیادہ کرو۔ اگر چندہ کم ہو کام کم کرو۔ چندہ ختم ہوجائے کام ختم کرو۔ ذرا ہمت کر کے تھوڑے دنوں اس پر عمل کرو۔ دیکھو تو خود بخود چندہ آنے لگے گا۔ جیسا مستغنی عن الدنیا(۱) کے لئے وعدہ نبوی ﷺ ہے (اَتَتْہُ الدُّنیَا وَھِیَ رَاغِمَۃٌ) ''ان کے پاس دنیا خود خواہشمند بن کر آتی ہے''

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس پر فرماتے تھے کہ ہم نے اس کا منظر حضرت مولانا قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں دیکھا ہے کہ بڑے بڑے امراء وعہدہ دار ڈپٹی کلکٹر وغیرہ خدمت میں آیا کرتے تھے۔ اور مولانا حجرہ میں ہوتے تو ان کے

(۱) دنیا سے استغناء کرنے والا۔

انتظار میں حجرہ کے باہر ٹوٹے پھٹے گرد آلود بوریہ پر بیٹھے رہتے۔ یہ تو اہل استغناء کی حالت ہے اور جو لوگ مانگا کرتے ہیں۔ لوگ ان کے آنے سے گھبراتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ بس اب چندہ مانگیں گے۔ اُن سے پوشیدہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ جس قدر کام اغراضِ دین کی حفاظت رکھتے ہوئے کر سکتے ہو وہ کام کرو۔ زیادہ فکر میں مبتلا نہ ہو۔ کیونکہ یہ تو سرکاری محکمہ ہے اس میں تبدل اور عزل سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ اس کو روزی کا وسیلہ سمجھنا خواہ مخواہ موجب شبہ ہوتا ہے۔ اگر تم حق پر ہو تو خود سب کو جذب کر لے گا۔ تم کو کسی کے در پر جانے کی حاجت نہ ہوگی اور یہی ہے حبل اللہ یعنی دین کی قوت جو سب کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔ بس اب تم خدا کے ہو جاؤ۔ خدا خود سامان کرے گا اور اُسی پر توکل کرو۔ ورنہ سمجھا جائے گا کہ تم خدا کے معتقد نہیں۔ اور تمہاری مثال اس حکایت کی طرح ہو جائے گی۔

حسن اعتقاد کا فائدہ

ایک مولوی صاحب بسم اللہ کے فضائل بیان کر رہے تھے کہ جو کام بسم اللہ پڑھ کے کیا جائے اُس میں ایسی برکت ہوتی ہے۔ وہ خوب اچھا ہوتا ہے، ایک گھسیارہ من کر بہت خوش ہوا۔ اچھا ہوا یہ نسخہ ہاتھ لگا۔ روز دریا سے پار اترنے کا پیسہ دینا پڑتا تھا۔ اب پیسہ روز بچے گا۔ چنانچہ وہ پانی میں سے بسم اللہ پڑھ کے پار ہو جاتا تھا اور کسی قسم کا خطرہ نہ ہوتا تھا۔ اس نے ان مولوی صاحب کی دعوت کی کہ جن کی بدولت یہ دولت ملی ہے ان کی دعوت تو کرنا چاہئے۔ جب مکان کو لے چلا تو راستہ میں دریا آیا۔ مولوی صاحب رک گئے۔ اُس نے کہا مولوی صاحب چلو۔ مولوی صاحب نے فرمایا کشتی تو ہے نہیں کیسے چلوں۔ اس نے کہا، جی بسم اللہ پڑھ کر چلئے اس دن آپ ہی نے تو وعظ میں مجھے نسخہ بتایا تھا۔ جب اس پر بھی مولوی

صاحب کی ہمت نہ ہوئی تو اس نے کہا چلئے میں آپ کو لے چلوں۔ چنانچہ مولوی صاحب کا بھی اُس نے ہاتھ پکڑ کر پار کر دیا۔ مولوی صاحب نے فرمایا بھائی تو تو عامل ہے اور میں نرا عالم ہوں۔

تو ایسے ہی ہم لوگ بتلاتے تو ہیں مگر ہمارے قلوب میں عظمت نہیں ہے جب تم ہی اپنے عقائد پر مستقیم نہ رہو گے تو دوسرے کو کیا بلاؤ گے مگر خیر پھر بھی نہ بلانے سے بلانا اچھا ہے۔

حبل اللہ

یہ وہ حبل اللہ ہے کہ جو شخص اس حبل اللہ کے ساتھ تمسک کرتا ہے اُس کے بارے میں ارشاد ہے۔

﴿فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا﴾ ''پس اُس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا''۔

کہ اُس کا تعلق قرب قیامت تک بلکہ قیامت کے بعد بھی منقطع نہیں ہوتا بہرحال ضعف اسلام میں نہیں۔ صرف اہل اسلام میں ہے۔ سو ان اہل اسلام کی تقویت کے واسطے یہ ارشاد فرمایا ہے۔ ولا تفرقوا کہ آپس میں تفرقہ اندازی نہ کرو۔ اور اب دیر ہو جانے کے سبب میں ترجمہ کر کے اس مضمون کو ختم کئے دیتا ہوں۔

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ﴾ اور تم حق تعالیٰ کی نعمتوں کو دیا کرو۔ ﴿اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۗءً﴾ جب کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ ﴿وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ﴾ تو تمہارے قلوب میں حق تعالیٰ نے محبت والفت کا تخم بو دیا۔ ﴿فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا﴾ تو تم اس کے احسان سے بھائیوں جیسی محبت کرنے لگے ﴿وَكُنْتُمْ عَلٰى شفا حفرة من النار﴾ تو تم قعر جہنم کے کنارہ پر پہنچ چکے تھے فقط اس میں گرنے کی

دیر تھی۔ ﴿فَاَنْقَذَكُمْ مِنْهَا﴾ تو تم کو حق تعالیٰ نے اُس سے نجات دی ﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ حق تعالیٰ تمکو کھلی کھلی علامتیں دکھاتا ہے تاکہ تم راہ راست پر آجاؤ۔ ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ﴾ یعنی ایک جماعت تم میں سے ایسی ہونا چاہیئے، جو داعی الی الخیر ہو۔ یعنی جو دین کی بقا میں کوشاں ہو اور شرعی امور اور دینی معاملات کا انتظام کرے۔

شریعت کا انتظام

اور امۃ منکم اس لئے فرمایا کہ اگر سب یہی کرنے لگیں تو کھیتی کون کرے گا اور نوکری تجارت وغیرہ کون کرے گا۔ یہ شریعت کا انتظام ہے کہ زراعت تجارت وغیرہ کو فرض کفایہ کیا ہے۔ اگر سب چھوڑ دیں تو سب کے سب گنہگار ہوں کیونکہ مجموعہ کو اسباب معیشت کی بھی حاجت ہے ورنہ سب ہلاک ہوجاویں اور نہ دنیا رہے نہ دین۔ اور جو لوگ تارک اسباب ہیں ان کی جمعیت وتوکل بھی مباشرین اسباب ہی کی بدولت ہے۔ گو ان کے آحاد کی تعیین نہیں مگر مجموعہ میں ایسے احاد کا ہونا ضروری ہے۔ خصوص ہم جیسے ضعفا کے لئے تو اگر ظاہری سامان نہ ہو تو تشویش سے دین ہی میں خلل پڑنے لگے۔

ایک ظریف درویش کی مجلس میں کسی نے کسی کو دُعا دی کہ ایمان کی سلامتی اور عاقبت بخیر نصیب ہو۔ درویش کہنے لگے اس کے معنی بھی جانتے ہو لوگوں نے کہا ترجمہ سے زیادہ تو معلوم نہیں۔ انہوں نے ظرافت سے کہا کہ ایمان کی سلامتی تو یہ ہے کہ روٹی اچھی طرح مل جائے اور عاقبت بخیر یہ ہے کہ پاخانہ کھل کے ہوجاوے۔

جب تک آرام سے بسر ہوتی ہے تب ہی تک ہمارا سب دینداری تقویٰ طہارت ہے۔ جو لوگ کماتے ہیں ان ہی کی برکت سے یہ رتبہ حاصل ہے جتکو تم

تحقیراً سگان دنیا کہا کرتے ہو حالانکہ تم سوتیلان دنیا ہو۔ یعنی وہ دنیا کے سگے ہیں اور تم سوتیلے ہو۔

اس پر حکامت یاد آئی کہ چھوٹے بچے سے کسی نے پوچھا کہ فلاں شخص تمہارے سگے بھائی ہیں۔ کہا سگے نہ کہئے۔ سگ تو کتے کو کہتے ہیں۔ حقیقی بھائی کہئے۔

دنیا سے تعلق

حاصل یہ ہے کہ دنیا سے سب کو تعلق ہے کوئی سگا ہے کوئی سوتیلا اور مطلق مذموم بھی نہیں کیونکہ دنیا مطلقاً بُری نہیں ہے بلکہ دنیا جو معصیت ہے صرف وہ بری ہے۔ اس لئے باری تعالیٰ نے ولتکن فرمایا کونوا نہیں فرمایا۔ جیسا کہ اوپر ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ فرمایا۔ اس لئے مقصود تو یہ ہے کہ دین تو سب میں ہو لیکن ایک ایسی ہی جماعت ہو جو مولویت ہی کا کام کریں اور کچھ دوسرا کام نہ کریں۔

علماء کی ترقی

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا۔ جو لوگ مولوی لوگوں کو الزام دیتے ہیں کہ یہ لوگ ترقی نہیں کرتے غلط ہے۔ کیونکہ اہل علم کی ترقی یہ ہے کہ علم میں کمال پیدا کریں۔ اگر وہ تجارت میں مشغول ہو جاویں تو ظاہر ہے کہ علم ضائع ہو جائے گا جس کی بقاء کی ضرورت آیت ولتکن منکم بتلا رہی ہے۔ جیسے کہ اہلِ تجارت اگر تبحر علمی میں مشغول ہوں تو تجارت ضائع ہو جائے۔

علماء کے کھانے پینے کا انتظام

اب رہا مولویوں کے کھانے کا سوال تو اس کا جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ حضور ﷺ کو خطاب فرماتے ہیں۔ (وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا

لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالعاقِبَةُ التَّقْوىٰ)

غرض ایک جماعت وعظ و تدریس وغیرہ کے واسطے ضرور وقف ہونی چاہئے اور اس کو رزق حق تعالیٰ دیں گے۔

مجھ کو ایک حکایت یاد آئی۔ میرا ایک بھتیجا جو بہت ذکی ہے بالکل بچہ تھا۔ میں نے اُس کو بلایا اور پوچھا کہ بتلاؤ عربی اچھی ہے یا انگریزی۔ کہنے لگا کہ عربی اچھی ہے میں نے کہا کہ عربی کیوں اچھی ہے کہا کیونکہ قرآن شریف عربی میں ہے ۔ میں نے پوچھا لیکن عربی پڑھ کے کھائے کہاں سے۔ اسے سن کر نہایت سنبھل کر جواب دیا جو میں اُسی کے لفظوں میں نقل کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ جب آدمی عربی پڑھتا ہے وہ خدا کا ہوجاتا ہے اور جب خدا کا ہوجاتا ہے تو خدا تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں ڈالتا ہے کہ اسے دو۔ وہ دیتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ میں نے کہا یہ بھی ٹھیک ہے لیکن لوگ ایسے شخص کو ذلیل سمجھتے ہیں کہنے لگا، ذلت تو جب ہوتی کہ وہ کسی سے مانگتا۔ وہ مانگتا ہے کب لوگ تو ہاتھ جوڑ کر دیتے ہیں۔ میں اُس کا حیرت سے منہ تکتا تھا کہ اس عمر میں اور سمجھ ۔

ایں سعادت بزور بازو نیست تانہ بخشد کدائے بخشندہ

''یہ سعادت بازو کی طاقت سے حاصل نہیں ہوتی۔ جب تک اللہ تعالیٰ نہ بخشنے والا''

سوء انتخاب

وہ اگرچہ آج کل انگریزی پڑھتا ہے لیکن اُس میں اب تک دین کا غلبہ ہے۔ چنانچہ جب کبھی وہ پاس ہوتا ہے تو اسکول سے آکر مجھ سے دین کی باتیں پوچھا کرتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ایسے لوگ دین کا کام کریں لیکن آج کل انتخاب غلط ہے جو فہم و ذکاء کے سبب عربی کے قابل ہوتا ہے اُسے انگریزی

پڑھواتے ہیں اور جو احمق سمجھا جاتا ہے اُس کو عربی پڑھاتے ہیں۔ غرض ہر کام اُلٹا۔

طالب علم کا توکل

میں نے یہ حکایت اس سوال کے جواب میں بیان کی ہے کہ کھائیں گے کہاں سے اور یہ امور صرف دلائل ہی نہیں بلکہ واقعات ہیں۔ غور کر کے دیکھو کہ کیسی سہولتیں ہوتی ہیں اور کسی کا احسان نہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ لوگ ہاتھ جوڑتے ہیں اور نہیں لیتے تو دل شکنی ہوتی ہے۔

مولانا فتح محمد صاحب کیرانہ میں تھے۔ ایک طالب علم مثنوی شریف پڑھنے آیا۔ آپ نے پوچھا کہ روٹی کہاں سے کھائے گا۔ اُس نے کہا، اللہ میاں روٹی دے گا ورنہ جان لے لے گا۔ آپ نے فرمایا، بیشک بھائی تو پڑھ لے گا۔ چنانچہ اسی وقت سے پڑھانا شروع کر دیا اور اس کی اُسی روز سے دعوتیں ہونا شروع ہوگئیں۔ کئی مہینے کیرانہ میں رہا برابر دعوتیں کھاتا رہا اور اگر کوئی خوشی سے اہل دین کی خدمت نہ کرے تو مالک الملک اسباب ایسے مسلط کر دیتے ہیں کہ جھک مار کر خدمت کرنا پڑتی ہے۔

طلباء کے کھانے کا جبری انتظام

چنانچہ مولانا فتح محمد صاحب ہی نے حکایت بیان کی کہ پانی پت میں ایک طالب علم قاری عبدالرحمٰن صاحب کے پاس قراءت سیکھنے گئے وہاں اہل محلّہ نے کھانے کا انتظام نہیں کیا۔ اتفاقاً ایک آدمی مرگیا اور وہاں قاعدہ تھا کہ مردہ کے گھر سے چالیس دن تک کسی محتاج کو کھانا کھلایا جاتا تھا بس ان کا کھانا مقرر ہوگیا۔ چالیس دن پورے نہ ہوئے تھے کہ دوسرا مرگیا۔ اور اس کے چلہ کے بعد تیسرا کھسکا۔ قاری صاحب نے فرمایا یہ سب محلّہ کو کھا جائے گا ورنہ اس کا کھانا مقرر

کردو۔ چنانچہ کھانا مقرر کردیا گیا۔

دیندار جماعت کی ضرورت

حاصل یہ کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تم میں ایک ایسی جماعت ہو اور پھر اُس سے دوسری شاخیں پھیلیں۔ وعظ کی شاخ، درس کی شاخ تصنیف کی شاخ، تربیت باطن کی شاخ وغیرہ وغیرہ۔ آگے اس جماعت کی اور صفات ارشاد ہیں۔ ﴿وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ کہ اچھے کاموں کا حکم بتادیں ﴿وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ اور بُرے کاموں سے روکیں۔ ﴿وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ یہی لوگ سعادت اور فلاح حاصل کرنے والے ہیں۔ ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا﴾ سبحان اللہ! کیا قرآن پاک کی بلاغت ہے اوپر تو خود تفرق سے (۱) نفی فرمائی۔ اب یہاں ارشاد ہے کہ تفرق کی مشابہت بھی نہ کرو کیونکہ مشابہت کرنے سے تم متفرقین کی طرح بن جاؤ گے۔ چنانچہ حدیث میں ارشاد ہے: (مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ) (۲) گو بعض لوگوں نے اس حدیث کی تضعیف کی ہے (۳) لیکن آیت تو ضعیف نہیں۔ خوب سمجھ لو۔ آیت کے کے معنی یہ ہوگئے کہ (لَاتَكُوْنُوْا كَالْكُفَّارِ) (۴) کیونکہ الذین تفرقوا کا مصداق کفار ہی ہیں اور یہ ممانعت اعمال میں تھی جو ہر وقت مشاہد بھی نہیں اور جو امور ہر وقت مشاہد بھی ہیں اور جو امور ہر وقت ظاہر رہتے ہیں جیسے لباس وغیرہ تو ان میں مشابہت کیسے جائز ہوسکتی ہے۔

تفسیر آیت

اب میں پھر ترجمہ شروع کرتا ہوں۔ ﴿وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ﴾ اور انہوں نے کھلی کھلی نشانیاں دیکھنے کے بعد باہم اختلاف کیا۔ واولئك

(۱) تفرقہ اختیار کرنے کی ممانعت کی (۲) جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے گا انہی میں شمار ہوگا (۳) حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ (۴) کافروں کی طرح نہ ہو۔

لھم عذاب عظیم اور ایسے لوگوں کے واسطے بہت بڑا عذاب ہے یوم تبیض وجوہ وتسود وجوہ یہ عذاب اُس دن ہوگا جس میں بہت سے چہرے سیاہ ہوجاویں گے بہت سے سپید ہوجاویں گے۔ ﴿ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْھُھُمْ ط اَکَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ ﴾ سیاہ چہرہ والوں سے خطاب ہوگا کیا تم ایمان کے بعد کافر ہوگئے اور ایمان سے مراد ایمان فطری ہے جس کی بابت ارشاد ہے: (کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُّوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ) ﴿فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا کُنْتُمْ تَکْفُرُوْنَ ﴾ تو اب تم اپنے کفر کے عوض میں عذاب بھگتو۔ ﴿وَاَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْھُھُمْ فَفِیْ رَحْمَۃِ اللّٰہِ ط ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ﴾ اور سپید چہرے والے اللہ تعالیٰ کی رحمت میں ہوں گے اور وہ ہمیشہ اُسی میں رہیں گے۔

خلاصہ وعظ

حاصل کلام یہ ہے کہ ان آیات میں مسلمانوں کے واسطے اتفاق کی تعلیم ہے کہ دین کے واسطے ہو اور علماء کی اتباع کے ساتھ ہو۔ کیونکہ اگر عوام علماء کا اتباع نہ کریں تو پھر کوئی دوسری صورت ہی نہیں۔ پس مسلمانوں کی دو جماعتیں ہیں۔ ایک خواص ایک عوام۔ دین پر قائم رہنا تو واجب مشترک ہے اس کے بعد عوام کے ذمہ یہ ہے کہ علماء کی تعلیم کے موافق عمل کریں اور خواص کی خدمت یہ ہے کہ ان کو بتائیں۔

اب بفضلہٖ سب ضروری اجزاء بیان ہوگئے۔ میں نے کلی مضامین بیان کردیئے تاکہ جزئیات پر منطبق کرلیا جائے (۱) ورنہ جزئیات تو کتابوں میں موجود ہیں۔ نیز کلیات کے بعد جزئیات کے سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے۔ اب میں دُعا کرتا ہوں سب صاحب دعا فرمائیے (۲)۔

(۱) اصول بیان کردیئے جزئی مسائل کو انہی پر منطبق کرلیا جائے (۲) اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس وعظ سے مستفید ہونے اور مذکورہ احکام پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

خلیل احمد تھانوی

۲۹/ اگست ۲۰۱۳ء